بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۵۹ | ۲۵ ستمبر ۲۰۲۲ء مطابق ۲۷ صفر المظفر ۱۴۴۴ھ | شمارہ نمبر ۲۲

اس شمارے میں

شعروادب تری معصوم ثناخوانی ہے گہواروں میں	سید عبدالرب صوفی مرحوم	۴
اداریہ ماہِ ربیع الاول کی برکات	شمس الحق ندوی	۵
نشانِ راہ دینی مدارس۔بقائے انفع کا قانون	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	۷
رہبرِ انسانیت سیرتِ نبویؐ کو پیش کرنے کی ضرورت	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۱۱
نقطۂ امتیاز اسلامی نظامِ حیات کا عملی نمونہ	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۱۶
اصلاحِ حال سیرت النبیؐ اور ہماری زندگی	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی	۱۸
دین وایمان مدارس اسلامیہ دین کے قلعے	مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ	۲۱
راہِ ھدایت کمالِ عبدیت کا سبق	مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی	۲۳
صحبتے با اھل دل معاشرہ پر تعلیم وتربیت کے اثرات	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۲۶
علم وادب مولانا سید ابوالخیر حسنیؒ برق کا.....	سید عرفان عامر حسینی ندوی	۲۷
رسید کتب تعارف وتبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۳۰
ھمارا سماج وہ ہم میں سے نہیں!	محمد جمیل اختر جلیلی ندوی	۳۲
فقہ وفتاویٰ سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۳۳

سرپرست

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی ❀ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❀ مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT

A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)

IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157

State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ایم میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT

Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406

website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/400	فی شمارہ -/20	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے 75$

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر ₹30/= جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر اطہر حسین نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر وادب

تری معصوم ثنا خوانی ہے گہواروں میں

سید عبدالرب صوفی مرحوم

اے خدا تیری مہک پھیلی ہے گلزاروں میں
اے خدا نور چمکتا ہے ترا تاروں میں

نام رٹتا ہے ترا باغ میں پتہ پتہ
سنگریزے ترا دم بھرتے ہیں کہساروں میں

خشک صحرا میں ترے نام کی خاموشی ہے
اور رونق ہے ترے کام کی بازاروں میں

نہیں تسبیح میں مصروف فقط غنچۂ و گل
اے خدا تذکرہ ہوتا ہے ترا خاروں میں

لہلہاتے ہوئے پودوں میں تری شادابی
اور خشکی ہے تری سوکھے ہوئے خاروں میں

دودھ پیتے ہوئے بچے بھی نہیں ہیں خاموش
تیری معصوم ثنا خوانی ہے گہواروں میں

لال چہرے میں مجاہد کے جھلک ہے تیری
اور چمک تیری ہے چلتی ہوئی تلواروں میں

لیکے آتے تھے ملائک تری نصرت کی نوید
غزوۂ بدر کے دن تیغ کی جھنکاروں میں

دھاک بیٹھی ہے غلامانِ نبی کی تیرے
آج بھی سارے زمانے کے جہانداروں میں

تھی ترے نام کی شوکت ترے اسلام کی شان
اے خدا خالدؓ وفاروقؓ کی للکاروں میں

تیرے موسیٰؑ کی جلالت کا مرقع دیکھا
قصر فرعون کی ٹوٹی ہوئی دیواروں میں

اے خدا صوفیؔ مسکیں سے بھی راضی ہوجا
وہ بھی اِک عمر سے ہے تیرے طلب گاروں میں

☆☆☆☆☆

اداریہ

ماہِ ربیع الاول کی برکات

شمس الحق ندوی

ربیع الاول کا مہینہ آتا ہے تو اس ذات گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذکر و یاد، میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پُر رونق جلسوں، علماء کی تقریروں اور مشاعروں سے فضا گونجنے لگتی ہے، جس سے انسانیت کا سر اونچا اور نام روشن ہوا، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثالی شخصیت نہ ہوتی تو انسانیت جس عالم گیر اندھیرے میں بھٹک رہی تھی جس میں انسان انسان کا خون چوس رہا تھا، طاقتور کمزور کو کھا رہا تھا، تو ہم انسانیت کے شرف وعظمت کے لیے کس کو پیش کرتے، اور انسانیت کا سر اونچا کرنے کے لیے کس کا نام لیا جاتا، خالق کائنات نے اپنی بے شمار مخلوقات میں جس انسان کے سر پر اپنی خلافت کا تاج رکھا تھا، اس کے اس شرف خلافت کی لاج کون رکھتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اس کائنات میں حسن واحسان اور جمال وکمال کا سب سے بڑا پیکر ہے، جس سے زیادہ صورت وسیرت اور کمال ظاہر و باطن کا دلکش انسانی نمونہ خالق و مالک اور قادر مطلق نے کوئی اور نہیں بنایا (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ کہنے والے نے سچ کہا ہے کہ:

صورت تری معیارِ کمالات بنا کر
دانستہ مصور نے قلم توڑ دیا ہے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی وہ ذات گرامی ہے جس پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں بھیجتا ہے، اور فرشتے اس کے لیے دعا کرتے ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نبی مانا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب پر خلوص دل سے ایمان لائے، ان کو بھی حکم ہو رہا ہے کہ تم ان پر درود وسلام بھیجو: "اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا"۔ [احزاب:۵۶]

اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائی آپ کا نام آتے ہی درود پڑھتے ہیں اور آسمانی درود کو بھی اس طرح بیان کرتے ہیں:

جب زبان پر محمدؐ کا نام آگیا
آسماں سے درود و سلام آگیا

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس محبوبؐ کو جس کو ہر اعتبار سے انسانیت کا کامل ومکمل نمونہ بنایا، معراج میں اپنے پاس ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ تک بلایا، جہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھی جانے کی اجازت نہیں، اسی کو ایک شیدائی نے اس طرح ادا کیا ہے:

تخیل کی رسائی ہو نہیں سکتی جہاں تم ہو
جہاں جلتے ہیں پر جبریلؑ کے آقا وہاں تم ہو

قیامت کے دن جب نفسی نفسی کا عالم ہوگا، عرش خداوندی کی داہنی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کرسی لگائی جائے گی، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا، اور سارے انبیاء واتقیاء کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رشک آئے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس شرف وبلندی کا راز یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کی صفات کے جامع اور خاتم الانبیاء ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم

عالم میں خدا کی تعلیم و ہدایت کے شاہد ہیں، نیکو کاروں کو فلاح و سعادت کی بشارت سنانے والے مبشر ہیں، ان کو جو اَب تک بے خبر تھے، ہوشیار و بیدار کرنے والے نذیر ہیں، بھٹکنے والے مسافروں کو خدا کی طرف پکارنے والے داعی ہیں، اور خود ہمہ تن نور اور روشن چراغ ہیں، "سراجاً منیراً" ہیں، آپ کی ذات اور آپ کی زندگی راستہ کی روشنی ہیں، جو راہ کی تاریکیوں کو دور کر رہی ہے، آپؐ ایسی شریعت لے کر بھیجے گئے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح کھول کر بیان فرمایا ہے:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً" [سورہ مائدہ:۳] (آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کر لیا)۔

اس لیے عقیدہ کی پختگی، اخلاق کی بلندی کے لیے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مکمل کوئی نمونہ نہیں، اس لیے اب جس کو جو کچھ ملے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اتباع سے ملے گا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ اور سیرت و کردار کو بھی قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے جو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے روشن چراغ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑی بات یہ بتائی کہ سب کا پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے، وہی سب کا مالک ہے، اس کو کوئی شریک نہیں۔

☆☆☆☆☆

امت کو منافرت دور کرنے کی ضرورت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

آج اس ملک کو آزاد ہوئے برسوں ہو چکے ہیں، ہندوستان اپنی اس طویل مدت میں آزادی کے آغاز کے مرحلہ سے گذر کر جوانی کے مرحلہ تک پہونچ چکا ہے، ہندو مسلم تعلقات کے نشیب و فراز کے لحاظ سے یہاں کے مسلمان بھی اکثریت و اقلیت کے تعلقات کے لحاظ سے مختلف مراحل سے گذر چکے ہیں، بلکہ گذر رہے ہیں، جس میں شریعت اسلامی کے تحفظ اور ملت کے بقاء وحفاظت کے مراحل شامل ہیں، اس دوران ان کو مختلف معاملات کا سامنا رہا ہے، الحمدللہ ملت کے قیادی سطح کے افراد نے اس سلسلہ میں پیش آمدہ تقاضوں کو خوبی کے ساتھ انجام دیا، جس کے اثر سے یہاں ملت اسلامیہ اپنی ملی زندگی میں خودداری کے ساتھ قائم ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جو دین عطا ہوا ہے، وہ دین نہایت جامع اور زندگی کے مختلف مراحل میں رہنمائی کرنے والا اور دائمی حیثیت کا حامل ہے، اس کو وقت کے بدلنے سے دین وملت کے بقاء وتحفظ کے تقاضوں کو بدلنے کی ضرورت نہیں پیش آتی، اس دین میں ایسی جامعیت ہے کہ وہ وقت کے بدلنے پر بھی پوری رہنمائی کرتا ہے، اس دین میں جامعیت کے ساتھ عالمیت کی بھی صفت ہے، وہ ملکوں اور علاقوں کے فرق سے بھی تبدیلی کا محتاج نہیں ہوتا، اسلام کی اس پختہ اور جامع خصوصیت نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کے ملی مسائل میں حسب ضرورت پوری مدد پہونچائی، پروردگار عالم نے ایک طرف تو اس دین کو دائمی اور جامع بنایا، دوسری طرف وہ برابر اس امت کے پیش آمدہ حالات پر نظر رکھتا ہے، اور مدد کرتا ہے، لیکن اس کے لیے وہ مسلمانوں کو اپنے دین کی رہنمائی میں اپنی عقل ودانش کو استعمال کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اس کی مدد اس کے لحاظ سے بھی ہوتی ہے، اس کی مدد کے حصول کے لیے مسلمانوں کو زندگی کے تین پہلوؤں کا اہتمام رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے:

ایک تو یہ کہ وہ اپنی زندگی کو اپنے رب کی ناپسندیدگی سے بچاتے رہیں۔ دوسرے یہ کہ زندگی کے تغیرات اور ملکی حالات پر بصیرت کی نگاہ رکھیں، اور اس کے لیے شریعت اسلامی نے جو رہنمائی دی ہے، اس سے کام لیں۔ تیسرے یہ کہ اپنی اس خصوصیت کو بھی پیش نظر رکھیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے قائدانہ امت کا مقام عطا کیا ہے، لہٰذا ان کا عمل ان کے اس مقام کے مطابق ہونا چاہیے۔

اس کے لیے خاص طور پر دو ذمہ داریاں ان پر عائد ہوتی ہیں:

ایک تو یہ کہ دوسروں کو خیر وصلاح کی دعوت دینا، اور ان کو انسانیت کے اعلیٰ معیار کی طرف لانے کی کوشش کرنا ہے۔ اور اس ملک میں اس بات کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے کہ یہاں کی اکثریت اسلام کی اعلیٰ خصوصیات سے ناواقف ہے، اس کو کم از کم اسلام کی جو مفید انسانی خصوصیات ہیں، ان سے واقف کرانے کی ضرورت ہے، اس ضرورت کو اگر مسلمان پورا کرتے ہیں، تو اس امت کو اکثریت کی طرف سے جو منافرت کا سامنا ہے، وہ خود بخود دور ہو جائے گی۔

☆☆☆

نشانِ راہ

آخری قسط

دینی مدارس - بقائے انفع کا بے لاگ قانون

۲۷ر محرم الحرام ۱۳۹۳ھ مطابق ۲ر مارچ ۱۹۷۳ء کو جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر میں کی گئی ایک اہم تقریر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

طب یونانی کو اس لیے زوال ہوا کہ باکمال لوگ ختم ہوگئے

میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں، شاید میں اور کوئی مثال دیتا تو اس کے سمجھنے میں دقّت ہوتی، یہ دیکھئے کہ ایک زمانے میں سارے ہندوستان میں طب یونانی کا زور تھا، ہر ہر جگہ مطب کھلے ہوئے تھے، اور ہندو اور مسلمان، اور نیک وبد اور جاہل وعالم سب حکماء کے پاس جاتے تھے، اور ان کے مطب کا یہ حال تھا کہ بس ایک بھیڑ لگی رہتی تھی، کیا آپ کہتے ہیں کہ طب یونانی کو زوال اس لیے ہے کہ ڈاکٹری آگئی ہے، ہومیو پیتھک آگئی ہے، اور جدید میڈیسن آگئی ہے، میں بالکل نہیں مانتا، طب یونانی کو اس لیے زوال ہوا کہ اب اس طرح کے طبیب نہیں پیدا ہوتے، اب اس طرح کے ذہین، طباع، ذی استعداد اور مجتہدانہ ذہن کے طبیب نہیں ہیں، اگر آج وہ پیدا ہوجائیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کے پاس ڈاکٹر جائیں، اس میں ذرا مبالغہ نہیں، آپ کے شہر کا سول سرجن جھک مار کر ان کے پاس جائے، جب اس کی تکلیف رفع نہیں ہوگی، تو کیا کرے گا، آپ ایک ایسا طبیب پیدا کردیجیے، میں جالینوس اور بقراط کا نام نہیں لیتا، میں افسر الاطباء حکیم عبدالعلی جھوائی ٹولہ اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں کا ذکر کرتا ہوں، حکیم محمود خاں کا ذکر کرتا ہوں، اگر ان کے پائے کا نہیں، ان کے آدھے کمال کا بھی آدمی کوئی پیدا ہوجائے تو طب یونانی کے زوال وغیرہ کی معیاری داستان ختم ہوجائے، اور معلوم ہوجائے کہ طب یونانی زندہ ہے، بات یہ ہے کہ پہلے درس نظامی پڑھ کر لوگ طب کی طرف متوجہ ہوتے تھے، جتنے بڑے بڑے علماء ہیں، تقریباً سب طب پڑھتے تھے، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، اکثر علماء اس زمانے میں طب پڑھتے تھے، ان میں سے بعض پیشہ کے طور پر اس کو اختیار کرلیتے تھے، اور بعض اس سے اشتغال نہیں رکھتے تھے، وہ منطق وفلسفہ پڑھے ہوئے، اور اشاراتِ طوسی وغیرہ پڑھے ہوئے، حل کیے ہوئے، جب طب کی طرف جاتے تھے، ذہین خاندانوں کے افراد ہوتے تھے، محنت کرتے تھے تو ان کو ایک ایسا ملکہ حاصل ہوجاتا تھا کہ نبض پر ہاتھ رکھا، اور اندر تک پہنچ گئے، اور ایک ایک رگ وریشہ کو پہچان لیا۔

مدارس کا بھی یہی حال ہے

یہی ہمارے آپ کے درس کا حال ہے، آپ کسی علم میں، کسی فن میں اختصاص پیدا کرلیں، امتیاز پیدا کرلیں، دنیا آپ کا لوہا مانے گی، اور معاشی مسئلہ بھی حل ہوجائے گا، اور مدارس کا جو مسئلہ اس وقت ہمارے یہاں درپیش ہے، یہ سب ختم ہوجائے گا، یہ سب دراصل ہماری پست ہمتی، سست کوشی اور ہماری کام چوری کی عادت کا نتیجہ ہے کہ آج کوئی استعداد پیدا نہیں ہورہی ہے، کس طرح کے فضلاء نکل رہے ہیں، دورہ کا امتحان لینے کے لیے لوگ گئے، اور معلوم ہوا کہ عبارت صحیح نہیں پڑھ سکتے، پہلی حدیث: "إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوَىٰ" ہی کو غلط پڑھا اور ترجمہ بھی غلط کیا، اسی طرح کے فضلاء مسلسل ادھر کئی سال سے نکل رہے ہیں، میرے خیال میں کوئی بیس پچیس سال سے یہ انحطاط نمایاں طریقے پر شروع ہوگیا ہے، اور پھر یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہمارا زمانہ نہیں رہا، ہمارے والدین نے ہماری عمر برباد کی، آج بھی ایسے لوگ ہیں کہ جنھوں نے کسی فن میں امتیاز پیدا کرلیا، اور جہاں ہیں وہاں مرجع خلائق ہیں، اور ان کا اٹھنا بیٹھنا مشکل ہے، اگر کسی نے کسی ایک صنف میں بھی کوئی امتیاز پیدا کرلیا تو بس پھر اس کے لیے فقر وفاقہ اور پریشانی بھی ختم اور اگر ہوگی بھی تو وہ کسی اپنی کمزوری کی وجہ سے ہوتو ہو۔

اصل مسئلہ محنت کا ہے

میں آپ سے ایک بات اور بھی کہہ دوں، حالانکہ میری زبان سے آپ اس کو سننے کے بالکل متوقع نہیں ہوں گے، آپ کو معلوم ہے کہ ہماری درسگاہ ندوۃ العلماء کی بنیاد ہی اصلاحِ نصاب پر ہے، حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ جیسا قدیم نظامِ تعلیم کا ساختہ پرداختہ اور اس کا بہترین نمونہ، وہ اس کا داعی، اور ہم بھی اس کے داعی، لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ زیادہ مسئلہ نصاب کا بھی نہیں،

زیادہ مسئلہ محنت کا ہے، اور اساتذہ کے پڑھانے کا ہے، قدیم نصاب سے وہ لوگ تیار ہوئے جو آج جدید نصاب سے تیار نہیں ہوتے ہیں، کیا بات ہے، حالانکہ یقینی بات ہے کہ قدیم نصاب سے جدید نصاب کی بعض چیزیں یقیناً بہتر ہیں، مثال کے طور پر جس زمانے میں "نفحة اليمن" اور "مقامات حریری" پڑھائی جاتی تھی، اور نثر کی کوئی ڈھنگ کی کتاب نہ تھی، جس سے زبان وادب کا صحیح ذوق اور اظہارِ خیال کی صلاحیت پیدا ہو، اس وقت تو ایسے لوگ پیدا ہوگئے، جنھوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے، علامہ زبیدی پیدا ہوئے، مولانا غلام علی بلگرامی پیدا ہوئے، شیخ محسن بن یحییٰ ترہتی پیدا ہوئے، اور نواب صدیق حسن خاں پیدا ہوئے، اور مولانا صدر الدین آزردہ پیدا ہوئے، اور اب جب کہ نثر کی اچھی اچھی کتابیں پڑھائی جارہی ہیں، اور اس میں عربی زبان کے بہترین نمونے جمع کردیے گئے ہیں، آج ایسے لوگ نہیں پیدا ہورہے ہیں، اگر نصاب اس کا ضامن ہوتا تو اب پیدا ہونا چاہیے، اور ہمیں لوگوں کو دیکھ لیجیے، مولانا مسعود عالم صاحب ندوی ہمارے رفیق تھے، اور ہمارے بڑے دوستوں میں تھے، انھوں نے عربی لکھنے میں بڑا کمال پیدا کیا، اور انھوں نے پڑھا کیا تھا؟ یہی حریری وغیرہ پڑھی تھی، میرے زمانے میں "مختارات" وغیرہ نہیں لکھی گئی تھی، اپنی طالبِ علمی کے زمانے میں میں نے بھی حریری پڑھی اور دوسری کتابیں پڑھیں، تو اس میں بہت کچھ انحصار اساتذہ کی محنت اور ذوق آفرینی اور طلبہ کی محنت اور جدوجہد پر ہے، نصاب معاون ہے، میں اب بھی نصاب کے تغیر کا داعی ہوں، لیکن تنہا اس پر انحصار نہیں۔

اصل بات

اصل میں شکایت تو یہ ہے کہ آپ حضرات نے محنت کرنی چھوڑ دی ہے، آپ حضرات کے اندر ولولہ نہیں، مسابقت کا جذبہ نہیں، آپ حضرات کسی فن میں کامل ہونے اور درس کی قوت پیدا کرنے کو فخر کی چیز ہی نہیں سمجھتے، اور ہمارے اسلاف ایسے تھے کہ ان کو بادشاہی ملتی ہو تو مدرسی کی خاطر اس کو وہ قبول کرنے کو تیار نہ تھے، مدرس بننے میں وہ اتنا بڑا اعزاز سمجھتے تھے کہ وزارت کو ٹھکرادیں، اور بعض بعض ایسے حضرات تھے کہ ہیں وزیر اور درس دے رہے ہیں، لکھنؤ میں وزیر آصف الدولہ کے زمانے میں سعادت علی خاں کے زمانے میں، روز ان کے یہاں رات کو درس ہوا کرتا تھا، اور دن کو وزارت کا کام ہوا کرتا تھا، ایسی بہت سی آپ کو مثالیں ملیں گی، تفضّل حسین خاں علامۂ ریاضی کے بہت بڑے عالم گزرے ہیں، یہ وزیر اودھ تھے، لیکن درس اس طرح دیتے تھے کہ گویا صرف مدرس ہیں، ایسی بہت سی مثالیں ہیں، لیکن اب ہمارے آپ کے اندر مدرس بننا وجہ افتخار نہیں رہا، بلکہ ہم اس سے شرماتے ہیں کہ ہم مدرس بن جائیں، تو ایک بات آپ سے یہ کہنا ہے کہ داخلی طور پر آپ استعداد درست کیجیے، محنت کیجیے، اور پتہ پانی کیجیے، اور دل ماریئے اور کسی فن میں کمال پیدا کیجیے۔

آج ہمارے مدارس میں اس وقت جو بہت بڑا مسئلہ ہے، جس کو کرائسس (CRISIS) کہنا چاہیے، وہ ہے مدرس کا مسئلہ، آج مدرس نہیں مل رہے ہیں، ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اتنی بڑی درسگاہ لیے بیٹھے ہیں، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں دو تین مدرس بعض فنون کے مل جائیں وہ نہیں مل رہے ہیں، آپ یہاں کمال پیدا کیجیے، دیوبند آپ کا محتاج ہوگا، ندوہ آپ کا طالب ہوگا، میں آپ کو لکھے دیتا ہوں کہ آپ جس وقت کسی فن میں کمال پیدا کرلیں گے، دیوبند میں آپ کی جگہ محفوظ، ندوہ میں آپ کی جگہ محفوظ۔

دینی صلاحیت پیدا کیجیے

ایک بات تو آپ سے یہ کہنا ہے، اور دوسری بات یہ، اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اندر دینی صلاحیت پیدا کیجیے، آپ کے اندر علمائے ربانی کے کچھ اوصاف ہوں، آپ کے اندر اس سیرت کی جھلک ہو جو ان بزرگوں میں تھی، حضرت مولانا محمد علی صاحب، ان کے معاصرین اور ان کے ساتھیوں میں تھی، کچھ استغناء ہو، کچھ توکل ہو، کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ سے تعلق ہو، کچھ آپ کو عبادت میں ذوق آئے، عوام کی سطح سے آپ کی سطح بلند ہو، اب یہ دو چیزیں ہوئیں، فن میں کمال، اور تعلق مع اللہ، یعنی جو علمائے ربانی کا شعار تھا کہ ان کے دیکھنے سے خدا یاد آتا تھا، ان کے پاس بیٹھنے سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی تھی، اور دل میں گداز اور ایک قسم کی حرارت پیدا ہوتی تھی، خدا کی محبت جوش مارتی تھی، کسی درجہ میں وہ بات پیدا ہو، یہ تو آپ کو داخلی طور پر کرنا ہے۔

خارج کے دو کام

خارجی طور پر میں دو باتیں آپ سے کہوں گا کہ یہ آپ کے کرنے کے کام ہیں، یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ اس وقت ایک ایسی مجلس میں گفتگو کررہا ہوں، جس میں امیر

شریعت تشریف رکھتے ہیں، اور جہاں اس نظام سے وابستہ بہت سے لوگ ہیں، میں بالکل دیانۃً آپ سے عرض کررہا ہوں "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" آپ نے جب میرا استقبال کیا ہے، مجھ پر اعتماد کیا ہے، تو مجھے کہنا چاہیے کہ ایک کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ کم سے کم صوبہ بہار واڑیسہ میں امارت کے نظام کو پھیلایئے، اور پورے صوبہ میں اس کا جال پھیلا دیجئے، کوئی گاؤں اور کوئی قصبہ اس سے خالی نہ ہو، یہ آپ کے اس صوبہ کے لیے اتنی بڑی نعمت ہے کہ مجھے اگر رشک آتا ہے اہل بہار پر تو اسی پر آتا ہے، یہاں اور بہت سی رشک کے قابل چیزیں ہوں گی، میں ان کا انکار نہیں کرتا، لیکن مجھے سب سے زیادہ یہ رشک آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس نعمت سے نوازا ہے کہ یہاں ایک نظامِ شرعی قائم ہے، اور لوگ اس کی قدر نہیں سمجھ رہے ہیں، اور بہت سے لوگ اس نظام کو کمزور کرنے کی بھی کوشش کرتے رہتے ہیں، میں آج ریل پر کہہ رہا تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے بڑے سے بڑے آدمی سے قیامت میں سوال ہوگا کہ تم نے بغیر شرعی نظام کے زندگی گزاری، تمہارا کوئی نظام نہیں تھا، کتنی سخت حدیثیں آئی ہیں کہ بعض مرتبہ آدمی کانپ جاتا ہے، تو میں آپ سے صفائی کے ساتھ یہ کہتا ہوں، مولانا ہوتے یا نہ ہوتے، میں آپ سے یہی کہتا کہ آپ کا پہلا فرض یہ ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد آپ اس امارتِ شرعیہ کے کام کو وسیع اور مستحکم کریں، اور سارے صوبہ میں اس کی شاخیں بنائیں، اڑیسہ کے حالات سے میں زیادہ واقف نہیں ہوں، لیکن کم سے کم بہار اور اڑیسہ کے بھی اگر طلبہ یہاں ہوں تو میں ان سے بھی کہتا ہوں کہ ان دونوں صوبوں کو اس نظام کے دامن میں لانے کی کوشش کریں، اور اس نظام سے ایسا مربوط کردیں کہ پورے صوبہ میں زندگی بالکل شرعی طریقے پر گزرنے لگے، اور بلکہ بہت اچھا ہوتا کہ جو صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام ہے، مثلاً اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ جمع کی جائے، اموالِ باطنہ کے متعلق نہیں کہتا، اور اگر اس کا موقع ہو تو آخر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے وہ نظام بھی نافذ تھا، بہرحال یہ آپ کا پہلا کام ہے، میں اس کام پر کسی کام کو ترجیح نہیں دیتا، آپ نے اگر یہ کام کرلیا تو آپ نے نہ صرف اس مدرسہ اور جامعہ رحمانیہ کا حق نمک ادا کیا، اور اس کے ساتھ آپ نے وفاداری کی اور اس کے سپوت ثابت ہوئے بلکہ آپ نے اس وقت دینی مدارس کے فرزندوں میں ایک امتیازی مقام پیدا کیا۔

دوسری چیز دینی مکاتب کا قیام ہے، معاف کیجیے گا، میں اس وقت عربی مدارس کی افادیت کا اتنا قائل نہیں ہوں کہ قصبے قصبے میں ہوں اور ہر جگہ دورہ ہو،، اور ہر جگہ بخاری شریف ضرور ختم ہو، لیکن ان مکاتب کی ضرورت زیادہ ہے، یعنی مسلمانوں کو دین کے مبادیات سے واقف کرانا، اردو کا تحفظ اور دینیات سے واقفیت اور حلال وحرام اور اس سے بڑھ کر کفر وایمان اور توحید وشرک، ان کا امتیاز ان کو ہوجائے، ہم آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، اور تیزی کے ساتھ ہندوستان بدل رہا ہے، ہر چیز کو نیشنلائز کیا جارہا ہے، یونیورسٹیوں کی باری آگئی، مسلم یونیورسٹی کی باری آگئی، کل مدارس کی باری آسکتی ہے، تو اس کے لیے مکاتب کا جال بچھا دیجیے، اور مساجد کو مسلمانوں کی زندگی کا مرکز بنایئے، سب سے آخر میں انقلاب کے قدم جہاں پر پہنچیں گے، وہ مسجدیں ہیں، اس لیے آپ ایسی جگہ اپنے مرکز بنایئے، جہاں دیر میں انقلاب پہنچے یا وہاں تک انقلاب پہنچتے پہنچتے قیامت آجائے، ممکن ہے موقع ہی نہ ملے تو آپ مساجد کو مرکز بنایئے، اور کثرت سے مکاتب قائم کیجیے، اور بالکل اس کی پرواہ نہ کیجیے کہ آپ نے مدرسہ میں یہ پڑھا تھا، وہ پڑھا تھا، اور وہ علوم اور معارف اور حقائق پڑھے تھے، اور اب یہاں بچوں کو پڑھا رہے ہیں، دیہاتیوں سے باتیں کررہے ہیں، آپ نے علم ضائع کیا کبھی اس کا خیال نہ کیجیے، مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، اور اسلام کا تحفظ، یہاں رہتے ہوئے استعداد پیدا کرنا، اپنے علم میں کمال پیدا کرنا، اچھے مدرس بنانا، اگر آپ نے یہ کرلیا تو آپ "وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ" کے مصداق ہوں گے، اور کوئی بے رحم اور بے درد ہاتھ، کوئی ظالم ہاتھ اور کوئی انقلاب وتغیر آپ کے نقش کو مٹا نہیں سکتا، اور آپ کو اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکتا، اور سچی بات ہے کہ آپ کے لیے کوئی انقلاب نہیں ہے، آپ کے لیے کوئی تغیر نہیں ہے، اس لیے کہ آپ نے اپنی نافعیت ثابت کردی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کے لیے خاص طور پر ضمانت ہے، جو دین کے ذریعہ دین کے راستے میں اپنی نافعیت ثابت کردے، جب ہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا "إن تهلك هذه العصابة لن تعبد" اے اللہ تیری عبادت کا

انحصار ان پر ہے، تیری توحید کی منادی کا انحصار ان پر ہے، آپ بھی ثابت کر دیجئے کہ "اللّٰھم إن تھلك ھذہ العصابة لن تعبد فی ھذہ الأرض" کم سے کم یہیں ہندوستان کے متعلق کہہ دیجیے، پھر کوئی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔

اگر آپ نے میری یہ باتیں یاد رکھیں، ہوسکتا ہے اس میں آپ کوئی جوش وخروش نہ پائیں، کوئی خطابت نہ پائیں، کوئی علمی تحقیق نہ پائیں، لیکن یہ آپ کے کام کی باتیں ہیں تو ان شاء اللہ آج سے دس برس کے بعد معلوم ہوگا کہ آپ نے ایک بہت بڑا حصار قائم کرلیا، نہ صرف اپنے لیے بلکہ تمام مدارس کے لیے اور دینی دعوت اور اس کے کام کے لیے، اگر یہ نہیں ہے تو مجھے ان دینی مدارس کے بند ہونے کا بہت خطرہ ہے، لیکن اگر آپ نے اللہ تعالیٰ کے یہاں مدد کا استحقاق پیدا کرلیا، اور یہاں آپ نے زندہ رہنے کا استحقاق ثابت کر دیا تو ان شاء اللہ پھر انقلاب کی کوئی دست برد آپ کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

رحم کی اپیل پر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی

اور اگر یہ نہیں تو محض تاریخ کے سہارے، محض روایات کے سہارے اور محض رحم کے استغاثے کے بل پر نہ کوئی جماعت رہ سکتی ہے، نہ کوئی ادارہ رہ سکتا ہے، نہ کوئی تنظیم رہ سکتی ہے، اگر آپ کسی پیام کے منتظر ہوں تو میرا پیام آپ کے سامنے یہی ہے، اگر آپ کسی درخواست کو سُن سکیں تو میری یہ آپ سے درخواست ہے، اگر آپ کسی مشورے کے طالب ہوں تو میرا آپ کو یہی مشورہ ہے، اس کے علاوہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

☆☆☆☆☆

بعثت محمدیؐ اور تعلیم وتعلم

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

نبی امی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی کا آغاز لفظ اقرأ (پڑھ) اور علم سے ہوا، اس وحی میں قلم کو علم کا عظیم وسیلہ قرار دیا گیا، جس سے علم کا تاریخی سفر وابستہ ہے، اور جس سے تصنیف وتالیف کی عالمگیر تحریک جاری ہوئی، اور علم ایک فرد سے دوسرے فرد، ایک قوم سے دوسری قوم، ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہا، دنیا میں علم کی اشاعت اور انسانی ضرورت کے مطابق اس کی عمومیت (پھیلاؤ) کا فخر اسی کو حاصل ہے، اور اس کی گردش وجنبش سے مدارس وجامعات اور علمی اداروں اور کتب خانوں کی دنیا آباد ہے۔

تعلیم وتعلم اور لکھنے پڑھنے کا آغاز بعثت محمدیؐ سے ہوا، اس سے پہلے ادیان ومذاہب میں کسب علم اور تعلیم پر پابندیاں عائد تھیں، بلکہ فکر وتدبر اور کتاب مقدس کے علاوہ دیگر کتابوں پر پابندی تھی، اسلام نے تعلیم وتعلم کے دروازے کھولے، جیسا کہ پہلی وحی سے معلوم ہوتا ہے، جس میں علم کے بعد اس کے وسیلہ قلم کا تذکرہ ہے، قرآن کریم میں جگہ جگہ تفکر، تدبر، شعور وآگہی، علم، عقل، فقہ، تفقہ اور تدبر فی خلق اللہ کے الفاظ آئے ہیں، لہٰذا اسلام نے ایک نئے عہد کا آغاز کیا، وہ انسانیت کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لایا، اور مذہبی پیشواؤں کے ظلم وزیادتی سے نکال کر جنہوں نے تعلیم وتعلم سے لوگوں کو محروم کر رکھا تھا، اور ارباب علم کو تختۂ دار پر چڑھا دیا تھا، حصول علم کی آزادی عطا کی۔

اسلام نے پہلا مدرسہ ہجرت سے پہلے دار الارقم میں کھولا، اور پھر ہجرت کے بعد مدینہ میں مسجد نبویؐ میں قائم کیا، غزوۂ بدر میں قریش کے جو افراد گرفتار کیے گئے، ان کا زرِ فدیہ تعلیم مقرر ہوا کہ وہ مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں، عہد نبویؐ کے بعد خلفاء اور مسلم سلاطین وامراء نے اس روش کو باقی رکھا، جگہ جگہ مساجد کے ساتھ ساتھ مدارس قائم کیے، لہٰذا نماز سے فراغت کے بعد مسجدیں مدرسوں میں تبدیل ہوجاتیں، اسلام کی اولین دانش گاہوں میں جامع قزوین، جامع عمروؓ بن العاص، جامع زیتونہ ہیں، اس کے بعد قاہرہ میں جامع ازہر اور اس کے بعد بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیے گئے، ان کے علاوہ اسلامی مملکت کے مختلف حصوں میں مسلم حکام اور اہل ثروت کی سرپرستی میں مدارس اور علمی وتعلیمی ادارے قائم تھے، جہاں تشنگان علم دور دراز کا سفر طے کر کے آتے اور کسب علم کرتے، اسلامی تاریخ میں سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں کہ مسلم علماء نے کسب علم کے لیے کیسی کیسی مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کیں، مسلم حکام اور سلاطین نے علماء اور تشنگان علم کی ہمت افزائی کی، مسلمانوں نے ہر دور میں اور ہر جگہ کسب علم اور اشاعت علم کے میدان میں ایسے عظیم الشان کارنامے انجام دیے جن کی کسی اور قوم ومذہب میں مثال نہیں ملتی، میدانِ تعلیم وتعلم میں مسلم علماء کے صبر وتحمل، عرق ریزی، جفاکشی، جانفشانی اور قربانیوں کی مثالیں سیر وسوانح اور تاریخ علوم وفنون میں جابجا دیکھی جاسکتی ہیں، جن سے مسلمانوں کے علمی ذوق وشوق اور طلب علم کا اندازہ ہوتا ہے، یہ سب نبی امی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا فیض ونتیجہ ہے۔

☆☆☆

رہبر انسانیت

سیرتِ نبوی کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

اس کائنات ارضی وسماوی اور اس کی لامحدود وسعتوں میں اصل ذات ان سب کو بنانے اور ان میں جاندار وبے جان ہر چیز کو پیدا کرنے والی واحد ذات اللہ تعالیٰ کی ہے جس نے یہ سب زمین وآسمان بنائے اور اس میں طرح طرح کی مخلوقات پیدا کیں اور ان میں سے انسانوں کو مخلوق کی زیادہ امتیازی خصوصیات عطا کیں، جن میں خاص طور پر علم سے فائدہ اٹھانے کی خصوصی صلاحیت عطا کی، اور اس صلاحیت کے ساتھ اس زمین پر اس کو آباد کرتے ہوئے اس کو ذمہ داریاں عطا کیں، اور ان ذمہ داریوں کی انجام دہی کی تاکید کی اور اس کے لیے دنیا میں رہ کر زندگی گزارنے کے تعلق سے جو جو ضرورتیں پیش آسکتی ہیں ان کے حصول کے لیے ان کے سب ضروری وسائل واسباب بھی مہیا کردیے۔

مذکورہ بالا خصوصیات کے تعلق سے انسان کو یہ دیکھنا اور سمجھنا ہے کہ اس زمین پر اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور ان کے سلسلہ میں اس کے خالق ومالک کا حکم کیا ہے؟ چنانچہ اس کو بتانے اور توجہ دلانے کے لیے جب جب اور جیسے جیسے ضرورت ہوتی رہی سب کا خالق ومالک اللہ رب العزت انہی انسانوں میں سے ممتاز صفات کے کسی فرد کو نبی مقرر کرتا رہا اور اس کے ذریعہ انسانوں کو ان کے خالق ومالک ہونے کے تعلق سے پیغام ہدایت پہونچاتا رہا تاکہ اس کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کو سنوارے اور اس زمین پر اپنی ذمہ داری انجام دینے کا فرض انجام دے، یہ نبی ورسول اپنی قوم پر نظر رکھتا اور یہ دیکھتا کہ وہ لوگ غلط کام تو نہیں کرنے لگے ہیں اور عیش وعشرت میں پڑکر اپنے مالک کے احسان کو بھول تو نہیں گئے، چنانچہ یہ نبی برابر آتے رہے اور اپنی قوموں کو غلط باتوں سے بچنے اور اپنے رب کے حکموں ہی پر چلنے کی دعوت دیتے رہے اور اس بات سے ڈراتے رہے کہ سب کے خالق ومالک کے جو احکام ہیں ان پر عمل نہ کرنے پر وہ تم سے ناراض ہوگا اور پھر گناہوں پر سزا دے گا۔

غرض انبیاء اپنی اپنی قوم کو غلط باتوں سے منع کرتے اور اپنے خالق ومالک کی فرمانبرداری کی طرف توجہ دلاتے اور اچھے برے کا فرق بتاتے تھے اور کہتے کہ تمہارے خالق اور رب نے جب سب نعمتیں دیں تو وہ کیسے یہ بات پسند کرے گا کہ اس کے احسانات کو انسان نظر انداز کرے اور اس کے مالک وخالق ہونے کا جو حق اس پر عائد ہوتا ہے اس کو نہ سمجھے اور سب سے بڑا جرم یہ کرے کہ محض اپنی خیالی رائے پر مخلوقات یا جمادات میں سے کسی دوسرے کو اپنا رب اور خدا بنا بیٹھے، یہ تو اتنا بڑا جرم ہے کہ اس پر تو وہ انسان کو فوراً سزا دے سکتا تھا اور زندگی کے سب سامان اور نعمتوں سے اس کو محروم کرسکتا تھا، لیکن وہ رحیم وکریم ہے، پہلے نبی بھیج کر توجہ دلاتا اور برے انجام سے ڈراتا اور ایک مدت تک رعایت فرماتا ہے، اس کے بعد بھی نبی کی بات نہ مانی جائے اور اپنے کو درست نہ کیا جائے تو پھر سزا دیتا ہے، اس طرح مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں اسی کام کے لیے بے شمار نبی اپنے اپنے زمانوں میں آئے اور ان میں سے ہر ایک نے لمبی لمبی مدت تک سمجھانے اور بتانے کا کام انجام دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اپنے کلام میں اس طرح کیا ہے:

”كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً، فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ، وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوا فِيْهِ، وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ إلا الَّذِيْنَ أُوتُوه مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْياً بَيْنَهُمْ، فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ، وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَن يَّشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ“ [سورہ بقرہ:۲۱۳] (پہلے تو سب لوگ ایک ہی طریقۂ کار پر تھے، (جب وہ حق باتوں سے ہٹنے لگے) تو خدا نے (ان کی طرف) بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے نبی بھیجے اور ان پر سچائی رکھنے والی کتابیں نازل کیں، تاکہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے تھے ان کے معاملہ میں فیصلہ کردے اور ان کے بارے میں اختلاف بھی انہی لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی تھی، باوجود یہ کہ ان کے پاس کھلے ہوئے احکامات آچکے تھے (اور یہ اختلاف انہوں نے صرف) آپس کی ضد سے کیا، تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اپنے حکم سے حق کی راہ دکھادی اور خدا جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھادیتا ہے)۔

اللہ تعالیٰ گزشتہ امتوں میں جب جب گمراہیاں بہت بڑھ جاتیں تو ان کی ہدایت کے لیے نبی مقرر کرتا جو وحی الٰہی کے تحت اس میں

ہدایت کا کام کرتا، نبی مقرر کرنے میں ایسے شخص کا انتخاب کرتا جو اپنی انسانی صلاحیتوں اور خصوصیات کے لحاظ سے بھی دوسرے لوگوں سے بہت بہتر اور مکمل ہوتا، چنانچہ ان خصوصیات کے ساتھ حسب ضرورت مختلف زمانوں میں نبی مقرر کیے جاتے رہے، آخری زمانہ کے لیے جو چھٹی صدی عیسوی سے شروع ہوا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبیلہ قریش سے جو اللہ تعالیٰ کے بڑے برگزیدہ نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے برگزیدہ فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں ممتاز خصوصیات کا قبیلہ تھا، مگر اپنے رب کی اطاعت وعبادت چھوڑ کر اپنی خواہش اور پسند کے لحاظ سے طرح طرح کی نافرمانی کی باتوں میں مبتلا ہو گیا تھا، اسی کے ایک نیک سیرت واچھے کردار کے فرد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی مقرر کیا گیا اور ان کی ذمہ داری کے کام میں عقیدۂ توحید کی صحت اور اپنے رب واحد کی عبادت اور اس کے حکموں پر چلنے کے ساتھ اس کے دیے ہوئے علم سے صحیح فائدہ اٹھانے اور اجتماعی نظام کو انسانی اور شریفانہ نظام بنانے کی ذمہ داری رکھی گئی اور وحی کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کی جاتی رہی، اور آپ کو سیرت وکردار اور اخلاق وصفات کے لحاظ سے اعلیٰ صفت انسانوں کا نمونہ بنا دیا گیا، اور اس طرح آپؐ میں انسانی زندگی کے تمام اعلیٰ اور مفید پہلو جمع ہو گئے اور آپؐ انسانی زندگی کی اعلیٰ صفات میں تمام انسانوں کے لیے ایسا نمونہ بن گئے کہ تمام انسانوں کو زندگی کے جس پہلو میں اعلیٰ نمونہ جاننے کی ضرورت ہو تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس نمونہ کو دیکھ سکیں اور اپنا سکیں اور نمونہ کا انسان معلوم کرنا ہو تو اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے یہ مطلوبہ نمونہ حاصل کر سکیں اور اس کا حکم بھی باقاعدہ اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب قرآن مجید میں دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيراً" [سورہ احزاب:۲۱] یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں عمدہ نمونہ ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ کی اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے اور بکثرت اللہ تعالیٰ کی یاد کرتا ہے۔

اس طرح حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انسانوں کے لیے ایک نمونۂ کامل کی حیثیت حاصل ہو گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وعمل اور خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ تعلیمات واحکام قیامت تک آنے والے انسانوں کو درست اور خدا کی بندگی کے طور طریق اختیار کرنے کے لیے رہبر اور رہنما بن گئے، اور وحی کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وفعل اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید شدہ ہو گیا، اسی کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

"مَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ" [سورۃ النساء:۸۰] (جو شخص رسول کی فرماں برداری کرے گا تو بیشک اس نے خدا کی فرماں برداری کی)۔

اور فرمایا: "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوىٰ إِنْ هُوَ إِلا وَحْيٌ يُوحَى" [سورہ نجم:۳-۴] (اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں، یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے)۔

اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کی تابعداری تا قیامت دائمی ہو گئی جس سے ہر سمجھدار شخص کے لیے فائدہ اٹھانا ضروری ہو گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کی قوموں میں اور زمانوں میں حسب ضرورت برابر انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے عہد کے خراب حالات کی اصلاح کے لیے اور اسی عہد کے مطابق ہدایت کے لیے پیغام لے کر آتے رہے، ان سب کے اخیر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور خاتم النبیین مبعوث کیے گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تعلیمات پروردگار عالم کی طرف سے دی گئی تھیں، وہ صرف مقامی لوگوں یا کسی خاص طبقہ کے لیے ہی نہیں دی گئیں، بلکہ وہ تمام انسانوں اور آئندہ آنے والے زمانوں کے لحاظ سے صحیح عقائد وعبادات کی تلقین کے لیے دی گئیں، چنانچہ فرمایا گیا:

"وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيْراً وَّنَذِيْراً وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ" [سورہ سبا، آیت نمبر:۲۸] (اور (اے محمد) ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے تمام انسانوں کو مخاطب کیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے علم اور پڑھانے کا دور شروع ہوا، اس کے لیے تحریر اور حفاظت علم کا جو اہتمام ہوا اس کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب باتیں بھی ضبط تحریر میں لے آئی گئیں، جو فوری طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام کے سینوں میں محفوظ ہو گئی تھیں، پھر جلد ہی ضبط تحریر میں لے آئی گئیں، ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب اقوال و احکام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے

تمام حالات بھی ضبطِ تحریر میں آ گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں قمری تاریخ کے لحاظ سے ۶۳ سال رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ۶۳ سالہ حیات طیبہ کے تین دور ہوئے، پہلا دور پیدائش سے لے کر ۴۰ سال کی عمر تک، دوسرا دور ۴۱ سے ۵۳ سال کی عمر تک اور تیسرا دور ۵۴ سے ۶۳ سال کی عمر تک، پہلا دور آپ کو نبوت کی ذمہ داری ملنے سے پہلے کا ہوا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان میں صاف ستھرے اخلاق وصفات اور اعلیٰ سیرت وکردار کے ساتھ گزارا اور اسی صاف ستھرے اور اعلیٰ کردار کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قبیلہ و خاندان میں بہت محبوب اور مقبول رہے، اسی دور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ۲۵ سال کی عمر کو پہونچنے پر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے اور اس وقت سے آپ گھریلو زندگی کی ذمہ داریاں انجام دینے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت اچھی رفیقۂ حیات ملی تھیں، جن کی طبیعت ومزاج آپ کی طبیعت ومزاج سے مل گیا تھا، چنانچہ ان کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بڑے انس وتعلق کی رہی اور ان سے اولادیں ہوئیں اور ان کی اچھی تربیت بھی ہوئی۔

۴۰ سال کی عمر ہونے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلا پیغام آیا اور پھر وہ وقتاً فوقتاً برابر آتا رہا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانوں کی ہدایت کے لیے ضروری بات کہنے اور کرنے کی آسمانی وحی کے ذریعہ بتائی جاتی رہی اور اس کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قوم کو سمجھانے اور حق بات اختیار کرنے کی تلقین کرنے کی ذمہ داری ڈالی جاتی رہی، یہ ۵۳ سال کی عمر پہونچنے تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا دوسرا دور تھا، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور گناہوں اور ظلم وزیادتی چھوڑنے کی نصیحت کرنے کا کام سپرد ہوا، جس کو آپ انجام دیتے رہے، اس کام کے شروع کرنے پر قوم ناراض ہونے لگی کہ ہم جو کچھ اپنے باپ دادا کو کرتے دیکھتے رہے ہم اس کو نہیں چھوڑیں گے اور اسی پر قوم کے اکثر وبیشتر لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنے لگے حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام سے روکنے کے لیے آپ کو اور آپ کے ماننے والوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دینے لگے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم صبر کرنے کا تھا، کہ تکلیفیں برداشت کرو اور دعوت واصلاح کے لیے کہتے رہو، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب برداشت کرتے رہے اور نصیحت کرتے رہے حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جان سے ماردینے کا غور ہونے لگا، مگر پھر بھی آپؐ صبر وتحمل کے ساتھ کام کرتے رہے، جب حالات ایسے ہوگئے کہ کام کرنا ناممکن ہوگیا اور آپ کو جان سے ماردینے کی سازش تیار ہوگئی اور دوسری طرف مدینہ منورہ کے بعض قبائل کی طرف سے آپ کی مدد ونصرت کا وعدہ بھی ہوگیا کہ آپ وہاں منتقل ہوجائیں اور وہاں سے کام کریں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ شہر چھوڑ کر مدینہ آگئے جہاں کے اہم لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں مکہ آکر سنی اور مان لی تھیں اور مدد کا وعدہ کیا تھا، اور اپنے یہاں آجانے کی پیشکش کی تھی، مدینہ والوں نے پھر اس پیشکش کو پوری طرح نباہا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں اپنے شہر کے سردار کی حیثیت سے ٹھہرایا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا تیسرا دور تھا۔

اور چونکہ اکثر اہل مدینہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات مان کر خدا اور اس کے رسولؐ کے حکموں کے تابعدار ہوگئے تھے، لہٰذا وہ مسلمان جو مکہ کے ۱۳ سالہ دور میں تھوڑی تعداد میں تھے اور بکھرے ہوئے تھے اور اپنے ہم وطن کافروں کا ظلم جھیل رہے تھے، یہاں مدینہ میں آکر مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک طرح سے محفوظ ہوگئے اور دونوں جگہوں کے مسلمانوں نے مل کر باقاعدہ ایک قوم کی حیثیت اختیار کرلی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکردگی میں ان کا باقاعدہ دینی اور سماجی نظام قائم ہوگیا، جس کے احکامات اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان احکامات کے مطابق خود بھی عمل کرتے تھے اور اپنے اصحاب اہل مدینہ کو بھی عمل کراتے تھے، یہ اہل مدینہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور مسلمانان مکہ کے آنے سے قبل مکہ کے قبیلہ سے الگ قبیلہ کے تھے اور ان کے درمیان کشمکش بھی تھی، لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد مکہ کے اور مدینہ کے مسلمان آپس میں بھائی بھائی کی طرح ایک قوم بن گئے، مکہ کے مسلمان مہاجر کہلائے اور مدینہ کے مسلمان انصار، مدینہ کے مسلمانوں نے مکہ سے آنے والے اپنے بھائیوں کی پوری نصرت کی اور ہر چیز میں ان کو شریک کیا، ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری قسم یہودی قبائل کی بھی تھی جو مدینہ میں آباد تھے لیکن وہ مسلمانوں سے الگ رہے، البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پرامن ساتھ رہنے کا معاہدہ کرلیا۔

مدینہ کی بڑی آبادی کے مسلمان ہوجانے کی وجہ سے وہاں باقاعدہ اسلامی معاشرہ قائم ہوگیا، جس میں ایمانی وحدت کے اثر سے اصل باشندے اور مکہ سے آئے ہوئے مہاجر مسلمان

سب ایک وحدت بن گئے، اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی میں اسلامی اقدار کا حامل معاشرہ بن گیا، اس کا ہر عمل اپنے نبی کی ہدایات کے مطابق ہوتا تھا اور آپ ان کی پوری تربیت کرتے تھے اور وہ پوری تابعداری کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے مطابق اپنی زندگی کو اعلیٰ کردار کے مطابق ڈھالتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر چلتے تھے، ادھر دوسری طرف مکہ کے مشرکوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے قبیلہ کے مسلمان ان کے قبضہ سے نکل گئے اور وہ مدینہ پہونچ کر مدینہ کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک بڑی طاقت بن گئے اور اب ان پر روک لگانا ان کے اختیار میں نہیں رہا تو وہ باقاعدہ فوجی طاقت کے ذریعہ مسلمانوں کو کچلنے کی تدابیر کرنے لگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خطرہ کو محسوس کر کے اپنے اصحاب کو بھی تیار رہنے کا حکم دیا اور معلوم کرتے رہے کہ مکہ والے کیا سازشیں کر رہے ہیں، تاکہ انہیں دفع کیا جاسکے۔

اس طرح مدینہ کے ان دس سالوں میں مسلمانوں کو کئی قسم کی ذمہ داریوں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑنے لگا، ایک تو پیغام الٰہی کو دوسروں تک پہنچانا جو کہ اسلام کا اصل مشن تھا اور اس کو نصیحت اور انسانی خیرخواہی کے ہی جذبہ سے انجام دینا تھا، صرف مقامی ہی نہیں، بلکہ دوسرے شہروں اور قبیلوں کے لوگوں کو بھی اپنی زندگیوں کو اپنے پروردگار کے حکموں کے مطابق سنوارنے کی تلقین کرنا تھا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورے عالم کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے، دوسرے مدینہ کے اپنے اصحاب کی دینی وعلمی اور اخلاقی تربیت کرنا تاکہ صفات واخلاق کے لحاظ سے بہتر سے بہتر خوبیوں کا معاشرہ وجود میں آئے، کیونکہ اسلام اسی بات کی پوری تلقین کرتا ہے کہ انسان صرف اپنی خواہشات پر عمل کرنے والا انسان نہ ہو، بلکہ اپنے رب کی نعمتوں کا شکرگزار اور نیک صفات اور صالح انسانی کردار کا انسان بنے، تیسرے مدینہ کے اپنے رفقاء واصحاب کی جماعت کا اجتماعی نظام قائم کرنا، تاکہ اجتماعی زندگی نظم وضبط اور آپس کی ہمدردی اور خیر طلبی کی بنے اور دشمنوں کے خطرات کے مقابلہ کے لیے جو ضروری دفاعی تدابیر ہوں ان کا نظم کیا جاسکے، چنانچہ اسی نظم وضبط اور حسن تدبیر کی بنا پر مکہ والوں کے متعدد فوجی حملوں کا مقابلہ کیا اور دشمن کو اس کی سازشوں میں ناکام بنادیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس پورے کام میں رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے کلام مقدس پر مشتمل کتاب قرآن مجید عطا کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے روشنی حاصل کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وحی کے ذریعہ جو حکم الٰہی آتا تھا اس پر عمل کرتے اور کراتے تھے، ان تمام معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ محض حکم دینا نہیں تھا، بلکہ اپنے اصحاب کے ساتھ عملی شرکت اور محبت واخلاق کے ساتھ بات کرنے کا تھا، انہیں بھلائی کی فکر کرنے اور بھلائی کو عام کرنے کیے لیے اپنی ذاتی زندگی سے نمونہ پیش کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر اس کا اچھا اثر پڑتا تھا کہ وہ دل و جان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشاروں پر چلتے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب باتوں کو اپنی یاداشت میں محفوظ بھی کر لیتے تھے، پھر اس سب کو انہوں نے اپنے بعد میں آنے والوں تک پہونچایا، اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اپنے مختلف پہلوؤں کے ساتھ آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ بھی ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی کتاب قرآن مجید جو بنیادی رہنمائی کے لیے پہلے سے حاصل ہوگئی تھی، تحریری طور پر کتابوں میں آجانے پر آنے والے زمانوں کے لوگوں کے لیے سہل الحصول ہوگئی۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق جو اس کے کلام الٰہی میں آیا ہے:

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْراً" [احزاب:۲۱] (کہ تمہارے لیے اللہ کے رسول میں اچھا نمونہ ہے، یہ ہر اس شخص کے لیے جو اللہ سے فضل وکرم کی امید قائم کرے اور آخرت اور حساب کے دن کا خیال کرے اور اللہ کو خوب یاد کرے)۔

قیامت تک تمام اہل ایمان کے لیے دستور حیات بن گئی جس کو جاننے اور اور اس کے مطابق عمل کرنے کی ذمہ داری ان سب انسانوں کے لیے ضروری ہوگئی جو خدا کو مانتے ہوں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں نجات چاہتے ہوں اور اپنے خدا کی یاد اپنی زندگی میں بسانا چاہتے ہوں۔

اسی لیے مسلمان اہل علم حضرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور آپؐ کی سیرت کے احوال کی جو تفصیل سے قلم بند ہوگئے تھے، زیادہ سے زیادہ اشاعت کی کوشش کی تاکہ قیامت تک آنے والے فائدہ اٹھاسکیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وحالات جن سے امت مسلمہ کو تاقیامت استفادہ کرنا

ہے دو پہلوؤں پر مشتمل ہیں، ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وہدایات جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو مختلف موقعوں پر دیں، اس کو حدیث نبوی کہتے ہیں، دوسرے وہ حالات جو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمل میں لائے ان کو سیرت نبوی کہتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان دونوں پہلوؤں کی باتوں کو حضورؐ کے صحابہؓ نے اپنے بعد کی نسل کے اہل ایمان کو پہونچایا، انہوں نے ان کو اپنے بعد کے لوگوں کو پہونچایا اور کتابوں میں سب قلم بند کرلیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان حالات میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ملتے ہیں ان میں ایسے حالات بھی پیش آئے جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا، جن کو تعداد اور طاقت اور پوزیشن میں مسلمانوں پر برتری حاصل تھی اور وہ اپنے وسائل کو اس مختصر جماعت کو ختم کرنے کے لیے استعمال کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے، اس طرح جنگ کے بادل مسلمانوں کے سر پر ہمیشہ منڈلاتے رہے، اپنے دفاع میں مسلمانوں کو تلواروں اور دیگر اسلحہ کو جو بمشکل میسر آئے استعمال کرنا پڑا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مسلح مقابلوں کو جو اپنے دفاع میں تھے بعد میں ان تاریخ نویسوں نے جو اسلام کو قبول کرنے کے لیے راضی نہ ہوسکے، بلکہ اس کی مخالفت کا طریقہ اختیار کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم اور جنگ پسندی کا الزام دیا، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی جنگ ایسی نہیں ہوئی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کی کارروائی کا خطرہ محسوس کیے بغیر محض ملک گیری کے لیے اختیار کی ہو، جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی، کسی خطرۂ جنگ کو روکنے کے لیے کی اور جنگ کے بعد قیدیوں اور دشمنوں کے ساتھ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معافی اور رحم کا برتاؤ کیا۔

حق کی حفاظت کی کوشش میں جو محنت و کوشش ہو اور اس سلسلہ میں اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالا جائے اس کو جہاد قرار دیا گیا، جہاد کے معنی اصل میں جدوجہد کرنے کے ہیں، اس طرح حق کی حمایت اور حق کے نفاذ کے لیے اور بلندی اخلاق کے لیے کوششوں کی مخالفت کرنے والوں سے مسلمانوں کو جو مقابلہ کرنا پڑا اس کے لیے بھی جہاد کے لفظ کو استعمال کیا گیا، لیکن اس کے معنی یہ رکھے گئے کہ یہ جدوجہد حق اور اپنے پروردگار کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہو، اپنے ذاتی فائدہ اور غرض مندی کے لیے نہ ہو اور اس راہ میں جو مشقت اور قربانی ہو اس کو برداشت کیا جائے، خواہ امن کی حالت میں ایسی کوشش ہو خواہ جنگ کی حالت میں ہو، لیکن اسلام کے مخالف لوگوں نے جہاد کے معنی ملک گیری اور دنیا طلبی کے لیے طاقت استعمال کرنے کو قرار دیدیا جو کہ بالکل غلط ہے، مسلمانوں کے مخالفوں نے اسی حوالہ سے اسلام کے خلاف اپنی کتابوں میں بہت سخت تبصرہ کیا، حالانکہ جہاد کے سلسلہ میں صاف صاف یہ ہدایت ہے کہ تم صرف اس سے لڑو جو تم سے لڑے اور اس لڑائی میں خدا کو راضی رکھنے کی نیت رکھو اور کسی بے گناہ کو نقصان نہ پہونچاؤ اور محض خواہشِ اقتدار کی بنا پر جنگ نہ کرو، صرف حق کی نصرت اور حفاظت کی ضرورت پڑنے پر جنگ کرو اور بصورت دیگر امن وامان اور صلح پسندی کے طریقے اختیار کرو، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سب صحابہؓ نے اسی طرح عمل کیا اور پھر اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری جنگوں میں اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے مقابلہ میں اعلیٰ انسانی کردار اختیار کیا گیا، چنانچہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے دشمنوں کے مقابلہ میں انتہائی کم تعداد میں دشمنوں کی جانیں گئیں۔

البتہ بعد کے زمانوں میں بعض مسلم حکمرانوں سے ان کی اپنی ذاتی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اسلام کے مقرر کردہ اصولوں کی پابندی کرنے میں کوتاہیاں بھی ہوئیں، لیکن ان کی جنگوں میں بھی مسلمانوں نے اپنے دشمنوں کی بہت کم جانیں لیں اور ان کے برعکس ان کے دشمنوں نے مسلمانوں کو بڑی تعداد میں مارا اور شہید کیا، اس کے برعکس مسلمانوں کے ہاتھوں جو دشمن مارے گئے ان کی تعداد بہت کم ہے جیسا کہ خود دشمن کے قلم سے لکھی گئی کتابوں میں درج ہوئی ہے، بہرحال کسی حکمراں نے اگر کچھ زیادتی کی ہو تو یہ اس کا ذاتی عمل قرار دیا جائے گا، اس کا الزام اسلام اور رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیا جاسکتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے طریقہ پر عمل کرنے والوں کے اس سلسلہ کے بھی بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار کو سیرت وکردار کے غیر جانب دارانہ مطالعہ سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے، اس سلسلہ میں متعدد اسلام مخالف مؤرخین نے جو غلط فہمی پیدا کی اور سیرت نبویؐ اور تاریخِ اسلام کو مخالفانہ انداز میں پیش کیا، اس سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہوگئی، اسلام کی صحیح تصویر پیش کرکے غلط فہمیاں دور کی جاسکتی ہیں جس کی اس زمانہ میں خاص طور پر بڑی ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆

نقطۂ امتیاز

اسلامی نظامِ حیات کا عملی نمونہ

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک ایسے نظام حیات کا محتاج ہے جو زندگی کے تمام ظاہری و باطنی حالات و کیفیات پر محیط ہو جو دل کی دھڑکنوں، نفس کے تقاضوں، جسم کی ضروریات، ہر ایک کی مکمل نگرانی کرتا ہو، جو نہ صرف دنیا کی چند روزہ زندگی میں کامیابی اور خوشحالی کے اصول وضوابط کی رہنمائی کرتا ہو، بلکہ آخرت کی دائمی اور ابدی زندگی میں بھی سعادت و کامرانی کی ضمانت لیتا ہو۔

انسانوں نے ہر زمانے میں اپنی عقل ودانش کے غرور میں بہت سے نظام زندگی ایجاد کیے، بہت سے اجتماعی نظریے اور اصول انہوں نے اپنی محدود عقل سے وضع کرکے نوع انسانی پر آزمائے لیکن کبھی کوئی انسانی نظریہ یا فلسفہ اور کوئی مصنوعی نظام کامیاب نہ ہوسکا، دنیا کی وسیع تجربہ گاہ میں ترقی یافتہ اور متمدن قومیں اپنے ترقی و تمدن کے زعم میں زندگی کے اصول ونظریات کا برابر تجربہ کررہی ہیں، اور برابر ناکامی ونامرادی سے دوچار ہورہی ہیں۔

اشتراکیت کے وسیع وعریض تجربات ہوں، یا سرمایہ داری کی دل آویز اصطلاح، جمہوریت کا پر فریب نعرہ ہو یا سوشلزم کا پرکشش دعوائے مساوات، ہر نظریہ زبان حال سے اپنی ناکامی اور شکست کا اعلان کرچکا، انسانیت کو اپنے دکھ درد کا مداوا کہیں بھی نہیں ملا، دل کا سکون، نفس کا اطمینان کسی بھی نظریہ اور کسی فلسفہ میں دریافت نہ ہوسکا۔

دنیا کے بڑے بڑے عقلاء نے اپنے علم و حکمت پر ناز کرتے ہوئے انسانی زندگی کے لیے قوانین وضع کیے اور دنیا کے سامنے مختلف اوقات میں مختلف نظامہائے حیات پیش کیے، لیکن کہیں بھی انسانی جذبات واحساسات زندگی کے تقاضے اور ضروریات کی تسکین نہیں ہوسکی، اس لیے کہ نظام زندگی کے جتنے بھی اصول ونظریات اور فلسفے اور ازم ایجاد ہوئے، کوئی بھی انسانی فطرت کے صحیح تقاضوں اور ضروریات کی بنیاد پر نہیں وجود پذیر ہوا۔

لیکن اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اس کے سامنے انسانی زندگی اپنے تمام ظاہر وباطن کے ساتھ ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح پھیلی ہوئی ہے، اس کی نظر ہر زاویہ سے اس کے تمام اجزاء پر مرکوز ہے، وہ روح کے تقاضوں، دل کے احساسات وجذبات، نفس کی ضروریات وخواہشات، جسم کے مطالبات ولوازمات کو اچھی طرح دیکھ اور سمجھ رہا ہے، وہ زندگی کی ہر حرکت وسکون، ہر پیچ وخم، ہر شعور ووجدان سے خوب واقف ہے، اس لیے وہ جو ضابطۂ حیات اور نظام زندگی پیش کرے گا، اس میں کسی قسم کی کمزوری، نقص اور جھول نہیں ہوگا، وہ سو فیصد انسانی نفسیات کا ساتھ دے گا، قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرے گا، دم بدم اس کی مدد کرے گا اور ہر لمحہ اس کے تعاون کے لیے اپنی خدمات پیش کرتا رہے گا۔

یہ صرف اس لیے کہ اسلامی نظام حیات اس ذات کا وضع کیا ہوا ہے جو انسانوں کا خالق ورازق ہے اور ان کی ہر چھوٹی بڑی ضروریات سے واقف ہے، انسان کی فطرت اور اس کا مزاج جس نظام زندگی کا متحمل ہوسکتا تھا اور جس میں اس کو اپنے تمام تقاضوں کا مکمل جواب مل سکتا تھا، وہ یہی نظام حیات ہے جس کو ہم اسلام کہتے ہیں۔

ہر انسان اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، لیکن بسا اوقات خارجی اسباب اس کی فطرت پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور وہ صحیح انسانی زندگی کی لذتوں سے محروم ہوکر غیر فطری زندگی، اور غیر طبعی اصول و نظریات کا عادی ہو جاتا ہے، جس طرح بعض جانور کبھی کبھی خارجی سبب کی بنا پر انسانوں کی نقل کرنے لگتے ہیں اور اپنی صحیح فطرت سے منحرف ہوجاتے ہیں، یہ بھی خالق کائنات کا ایک اصول ہے کہ جب مخلوق اپنے فطری وظیفہ سے پھر کر غیر فطری امور میں مشغول ہوتی ہے تو اس کی فطرت مسخ کردی جاتی ہے، لیکن کبھی تو ظاہری وباطنی دونوں اعتبار سے اور کبھی صرف باطنی اعتبار سے۔

"فَلَمَّا عَتَوا عَمَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ" [أعراف:۱۶۶] (جب وہ جس کام سے ان کو منع کیا گیا تھا اس میں حد سے نکل گئے تو ہم نے ان کو (براہ قہر) کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ)۔

دوسری آیت میں باطنی تغیر کی طرف اشارہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے: "أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ" [أعراف:۱۷۹] (وہ لوگ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے)۔

ایک دوسری جگہ یوں ارشاد ہوا ہے:

"أُولَئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ" [نحل:۱۰۸] (یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر مہر لگادی ہے اور یہ لوگ انجام سے بالکل غافل ہیں)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اسلامی زندگی کا مکمل نمونہ تھی، آپ کے اصحاب نے آپ کی کامل اتباع کی اور صحیح اسلامی نظام حیات کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا، صرف اخلاق وعبادات اور فضائل وآداب میں نہیں، بلکہ سیاست وحکومت میں بھی انہوں نے ایسی مثال پیش کی جو انہیں کا حق تھا، بعد میں آنے والے بہت سے حکمرانوں نے ان کے نقشِ قدم پر چل کر بادشاہی میں فقیری اور حکمرانی میں زہد و قناعت کا بہترین نمونہ پیش کیا۔

اسلامی نظام زندگی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نظام میں بڑے چھوٹے، اونچ نیچ، امیر وغریب، بادشاہ ورعایا میں بحیثیت انسان کے کوئی فرق نہیں، بادشاہ وقت اگر کوئی معمولی غلطی بھی کر رہا ہو تو رعایا کے ہر فرد کو اس پر متنبہ کرنے اور اس کی کمزوری پر مواخذہ کرنے کا حق حاصل ہے، اس کے باوجود بھی اگر خلیفۂ وقت یا امیر یا بادشاہ اپنی غلطی سے باز نہ آئے تو رعایا کے ایک فرد کو پوری رعایا کی طرف سے بغاوت اور فرمان شکنی کا اعلان کرنے کا حق حاصل ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ مقرر ہوئے اور امیر المؤمنین کے منصب پر فائز ہوئے تو انہوں نے اپنی سب سے پہلی خلافت کی تقریر میں فرمایا: ''...اے لوگو! میں تمہارا والی بنایا گیا ہوں، حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں، اگر تم مجھ کو حق پر پاؤ تو میری مدد کرو اور اگر باطل پر پاؤ تو مجھے روکو، اور دیکھو جب تک میں اللہ کی اطاعت کرتا رہوں تم لوگ میری اطاعت کرتے رہو، لیکن اگر مجھ سے اللہ کے احکام کی نافرمانی سرزد ہو تو تم میری اطاعت نہ کرنا...''۔

اسلامی نظام حیات اخوت اور جرأت ایمانی کا سبق دیتا ہے، اس نظام میں رعیت کے ایک معمولی فقیر کو وہی انسانی حقوق حاصل ہیں جو ایک بڑے صاحب حیثیت امیر وکبیر کو حاصل ہوتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جب خلیفہ مقرر ہوئے تو رعایا کے ایک عام فرد نے ان کو مخاطب کر کے کہا کہ:

''...عمر! اگر ہم آپ کے اندر کسی طرح کی کوئی کجی پائیں گے تو یاد رکھئے اس کو تلوار کی دھار سے درست کریں گے...''۔

یہ تاریخی جملہ اسلام کی سیاسی اور اخلاقی تاریخ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت میں ہمیشہ محفوظ رہے گا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اس جملہ کو سن کر بجائے اس کے کہ خفا ہوتے یا اس شخص کو توہین خلافت کی سزا دیتے، بہت خوش ہوئے اور اللہ کا شکر ادا کیا اور فرمایا:

الحمد للّٰہ الذی جعل في أمة عمر من یقومه بالسیف (خدا کا شکر ہے جس نے عمر کے رعایا میں ایسے لوگوں کو باقی رکھا ہے جو اس کو تلوار سے سیدھا کر سکیں)۔

ایک صحابی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ حضور! مجھے ایسی نصیحت فرمادیں کہ وہ میرے لیے کافی ہو اور آپ کے بعد پھر کسی سے کچھ پوچھنا نہ پڑے، فرمایا:

قل امنت باللّٰہ ثم استقم (کہو میں ایمان لایا اللہ پر، پھر اس پر جم جاؤ)۔

استقامت کے معنی علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کی اطاعت کو لازم پکڑنا اور کسی حال میں اس کی نافرمانی اور معصیت نہ کرنا۔

یہی وہ نقطۂ امتیاز ہے جہاں اسلامی نظام زندگی کی راہ انسانوں کے بتائے ہوئے نظام حیات سے الگ ہو جاتی ہے، اس نظام زندگی کا سب سے اہم اور مرکزی دستور ہے: لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق یعنی اللہ کی نافرمانی ہو تو مخلوق کی بات نہیں مانی جائے گی، یہیں سے زندگی کے وہ تمام مادی نظریے الگ ہو جاتے ہیں جہاں خالق کا تصور ہی سرے سے نہیں ہے، اور اگر کسی حال میں ہے بھی تو اس کا حق اتنا محدود ہے کہ نہ ہونے کے برابر، لیکن اسلام زندگی کی خشت اول ہی کو تصور الٰہ کی بنیاد پر رکھتا ہے، یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے زندگی کا سوتا پھوٹتا ہے، اور پوری کائنات کو آبِ حیات تقسیم کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

خود فراموش اور خدا فراموش

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

خدا فراموشی انسان کو بداخلاقی، خیانت اور بددیانتی پر دلیر بنا دیتی ہے، اس میں جوابدہی کا احساس ختم ہو جاتا ہے، اور جو شخص اس نوبت پر آجائے وہ سماج کے لیے ناسور بن جاتا ہے، وہ سماج کیسا گہوارۂ امن ہوگا جس میں ہر شخص اپنے جیسے انسانوں کے بجائے خدا سے پانے کا یقین رکھتا ہو، جس میں ایک فاقہ مست انسان بھی ہیرے کے قیمتی ہار پر نگاہ حرص ڈالنے کو تیار نہ ہو، جس کو نہ آنکھ نے دیکھا ہو، نہ زبان نے ٹوکا ہو، نہ دشمنوں نے اس کے خلاف رپورٹ لکھوائی ہو، مگر اس کا ضمیر اس کے کردار وعمل کا محافظ ہو۔

☆☆☆

اصلاحِ حال

سیرت النبیؐ اور ہماری زندگی

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

آپؐ کا تذکرہ باعثِ سعادت

۱۲ ربیع الاوّل ہمارے معاشرے، ہمارے ملک اور خاص کر برصغیر میں باقاعدہ ایک جشن اور ایک تہوار کی شکل اختیار کرگئی ہے، جب ربیع الاوّل کا مہینہ آتا ہے تو سارے ملک میں سیرت النبیؐ اور میلاد النبیؐ کا ایک غیر متناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، ظاہر ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک تذکرہ اتنی بڑی سعادت ہے کہ اس کے برابر کوئی سعادت نہیں ہوسکتی، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں آپؐ کے مبارک تذکرہ کو اس ماہ ربیع الاوّل کے ساتھ بلکہ صرف ۱۲ ربیع الاوّل کے ساتھ مخصوص کردیا گیا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ ۱۲ ربیع الاوّل کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی، اس لیے آپ کا یوم ولادت منایا جائے گا اور اس میں آپ کی سیرت اور ولادت کا بیان ہوگا۔

لیکن یہ سب کچھ کرتے وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ جس ذاتِ اقدس کی سیرت کا یہ بیان ہورہا ہے اور جس ذات اقدس کی ولادت کا یہ جشن منایا جارہا ہے، خود اس ذاتِ اقدس کی تعلیم کیا ہے؟ اور اس تعلیم کے اندر اس قسم کا تصور موجود ہے یا نہیں؟

تاریخ انسانیت کا عظیم واقعہ

اس میں کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہوسکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس دنیا میں تشریف لانا، تاریخ انسانیت کا اتنا عظیم واقعہ ہے کہ اس سے زیادہ عظیم، اس سے زیادہ پُرمسرت، اس سے زیادہ مبارک اور مقدس واقعہ اس روئے زمین پر پیش نہیں آیا، انسانیت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا نور ملا، آپؐ کی مقدس شخصیت کی برکات نصیب ہوئیں، یہ اتنا بڑا واقعہ ہے کہ تاریخ کا اور کوئی وقعہ اتنا بڑا نہیں ہوسکتا اور اگر اسلام میں کسی کی یوم پیدائش منانے کا کوئی تصور ہوتا تو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یوم پیدائش سے زیادہ کوئی دن اس بات کا مستحق نہیں تھا کہ اس کو منایا جائے اور اس کو عید قرار دیا جائے، لیکن نبوت کے بعد آپ ۲۳ سال اس دنیا میں تشریف فرما رہے اور ہر سال ربیع الاوّل کا مہینہ آتا تھا، لیکن نہ صرف یہ کہ آپ نے ۱۲ ربیع الاوّل کو یوم پیدائش نہیں منایا، بلکہ آپ کے کسی صحابی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ نہیں گزرا کہ چونکہ ۱۲ ربیع الاوّل آپؐ کی پیدائش کا دن ہے اس لیے اس کو کسی خاص طریقے سے منانا چاہیے۔

۱۲ ربیع الاوّل اور صحابۂ کرام

اس کے بعد سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے اور تقریباً سوا لاکھ صحابہ کرام کو اس دنیا میں چھوڑ گئے وہ صحابہ کرام ایسے تھے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سانس کے بدلے اپنی پوری جان نچھاور کرنے کے لیے تیار تھے، آپؐ کے جانثار، آپؐ پر فدا کار، آپؐ کے عاشق زار تھے، لیکن کوئی ایک صحابی ایسا نہیں ملے گا جس نے اہتمام کرکے یہ دن منایا ہو یا اس دن کوئی جلسہ منعقد کیا ہو، یا کوئی جلوس نکالا ہو، یا کوئی چراغاں کیا ہو، یا کوئی جھنڈیاں سجائی ہوں، صحابہ کرامؓ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس لیے کہ اسلام کوئی رسموں کا دین نہیں ہے، جیسا کہ دوسرے اہل مذاہب ہیں کہ ان کے ہاں چند رسومات ادا کرنے کا نام دین ہے، جب وہ رسمیں ادا کرلیں تو بس پھر چھٹی ہوگئی، بلکہ اسلام عمل کا دین ہے اور یہ تو جنم روگ ہے کہ پیدائش سے لے کر مرتے دم تک ہر انسان اپنی اصلاح کی فکر میں لگا رہے اور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع میں لگا رہے۔

کرسمس کی ابتداء

یوم پیدائش منانے کا یہ تصور ہمارے ہاں عیسائیوں سے آیا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یوم پیدائش کرسمس کے نام سے ۲۵ دسمبر کو منایا جاتا ہے، تاریخ اُٹھا کر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اُٹھائے جانے کے تقریباً تین سو سال تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم پیدائش منانے کا کوئی تصور نہیں تھا، آپ کے حوارین اور صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے یہ دن نہیں منایا، تین سو سال کے بعد کچھ لوگوں نے یہ بدعت شروع کردی اور یہ کہا کہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یوم پیدائش منائیں گے، اس وقت بھی جو لوگ دین عیسوی پر پوری

طرح عمل پیرا تھے انہوں نے ان سے کہا کہ تم نے یہ سلسلہ کیوں شروع کیا ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں تو یومِ پیدائش منانے کا کوئی ذکر نہیں ہے، انہوں نے جواب دیا کہ اس میں کیا حرج ہے؟ یہ کوئی ایسی بات تو نہیں ہے بس ہم اس دن جمع ہو جائیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کریں گے، ان کی تعلیمات کو یاد دلائیں گے اور اس کے ذریعے سے لوگوں میں ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہوگا، اس لیے ہم کوئی گناہ کا کام تو نہیں کر رہے ہیں، چنانچہ یہ کہہ کر یہ سلسلہ شروع کر دیا۔

کرسمس کی موجودہ صورتحال

چنانچہ شروع شروع میں تو یہ ہوا کہ جب ۲۵ر دسمبر کی تاریخ آتی تو چرچ میں ایک اجتماع ہوتا، ایک پادری صاحب کھڑے ہو کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور آپؑ کی سیرت بیان کر دیتے، اس کے بعد اجتماع برخواست ہو جاتا، گویا کہ بے ضرر اور معصوم طریقے پر یہ سلسلہ شروع ہوا، لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد انہوں نے سوچا کہ ہم پادری کی تقریر تو کرا دیتے ہیں، مگر وہ خشک قسم کی تقریر ہوتی ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ نوجوان اور شوقین مزاج لوگ تو اس میں شریک نہیں ہوتے، اس لیے اس کو ذرا دلچسپ بنانا چاہیے، تاکہ لوگوں کے لیے دلکش ہو اور اس کو دلچسپ بنانے کے لیے اس میں موسیقی ہونی چاہیے، چنانچہ اس کے بعد موسیقی پر نظمیں پڑھی جانے لگیں پھر انہوں نے دیکھا کہ موسیقی سے بھی کام نہیں چل رہا ہے، اس لیے اس میں ناچ گانا بھی ہونا چاہیے، چنانچہ پھر ناچ گانا بھی شامل ہو گیا پھر سوچا کہ اس میں کچھ تماشے بھی ہونے چاہیے، چنانچہ ہنسی مذاق کے کھیل تماشے شامل ہو گئے، چنانچہ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ وہ کرسمس جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات بیان کرنے کے نام پر شروع ہوا تھا، اب وہ عام جشن کی طرح ایک جشن بن گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ناچ گانا اس میں، موسیقی اس میں، شراب نوشی اس میں، قمار بازی اور جوا اس میں گویا کہ اب دنیا بھر کی ساری خرافات کرسمس میں شامل ہو گئیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات پیچھے رہ گئیں۔

کرسمس کا انجام

اب آپ دیکھ لیجیے کہ مغربی ممالک میں جب کرسمس کا دن آتا ہے، تو اس میں کیا طوفان برپا ہوتا ہے، اس ایک دن میں اتنی شراب پی جاتی ہے کہ پورے سال اتنی شراب نہیں پی جاتی، اس ایک دن میں اتنے حادثات ہوتے ہیں کہ پورے سال اتنے حادثات نہیں ہوتے، اسی ایک دن میں عورتوں کی عصمت دری اتنی ہوتی ہے کہ پورے سال اتنی نہیں ہوتی اور یہ سب کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یومِ پیدائش کے نام پر ہو رہا ہے۔

میلاد النبی کی ابتداء

اللہ تعالیٰ انسان کی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے واقف ہے، اللہ تعالیٰ یہ جانتے ہیں کہ اس کو ذرا سا شوشہ دیا گیا تو یہ کہاں سے کہاں بات کو پہنچائے گا، اس واسطے کسی کے دن منانے کا کوئی تصور ہی نہیں رکھا، جس طرح ''کرسمس'' کے ساتھ ہوا، اسی طرح یہاں بھی ہوا کہ کسی بادشاہ کے دل میں خیال آ گیا کہ جب عیسائی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یومِ پیدائش مناتے ہیں تو ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یومِ پیدائش کیوں نہ منائیں؟ چنانچہ یہ کہہ کر اس بادشاہ نے میلاد کا سلسلہ شروع کر دیا، شروع میں یہاں بھی یہی ہوا کہ میلاد ہوا جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا بیان ہوا اور کچھ نعتیں پڑھی گئیں، لیکن اب آپ دیکھ لیں کہ کہاں تک نوبت پہنچ چکی ہے۔

یہ ہندوانہ جشن ہے

یہ تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود الحمدللہ وہاں تک ابھی نوبت نہیں پہنچی جس طرح عیسائیوں کے ہاں پہنچ چکی ہے، لیکن اب بھی دیکھ لو کہ سڑکوں پر کیا ہو رہا ہے، کس طرح روضہ اقدس کی شبیہیں کھڑی کی ہوئی ہیں، کس طرح کعبہ شریف کی شبیہیں کھڑی کی ہوئی ہیں، کس طرح لوگ اس کے اردگرد طواف کر رہے ہیں، کس طرح اس کے چاروں طرف ریکارڈنگ ہو رہی ہے، کس طرح چراغاں کیا جا رہا ہے او رکس طرح جھنڈیاں سجائی جا رہی ہیں، معاذ اللہ ایسا معلوم ہو رہا ہے یہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا جشن نہیں ہے بلکہ جیسے ہندوؤں اور عیسائیوں کا عام جشن ہوتے ہیں اس طرح کا کوئی جشن ہے اور رفتہ رفتہ ساری خرابیاں اس میں جمع ہو رہی ہیں۔

یہ اسلام کا طریقہ نہیں

سب سے بڑی خرابی یہ سب کچھ دین کے نام پر ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس نام پر ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس نام پر ہو رہا ہے، اور سب کچھ ہو رہا ہے کہ یہ بڑے اجر و

ثواب کا کام ہے اور یہ خیال کررہے ہیں کہ آج ۱۲ ربیع الاوّل کو چراغاں کرکے اور اپنی عمارتوں کو روشن کرکے اور اپنے راستوں کو سجا کر ہم نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا حق ادا کردیا اور اگر ان سے پوچھا جائے کہ آپ دین پر عمل نہیں کرتے؟ تو جواب دیتے ہیں ہمارے یہاں تو میلاد ہوتا ہے، ہمارے یہاں تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یوم پیدائش پر چراغاں ہوتا ہے، اس طرح دین کا حق ادا ہورہا ہے، حالانکہ یہ طریقہ اسلام کا طریقہ نہیں ہے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نہیں ہے، آپؐ کے صحابہ کرامؓ کا طریقہ نہیں ہے اور اگر اس طریقے سے میں خیر و برکت ہوتی تو ابوبکر صدیق، فاروقِ اعظم، عثمان غنی اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم اس سے چوکنے والے نہیں تھے۔

بنیے سے سیانا سو باؤلا

میرے والد حضرت مفتی محمد شفیع قدس سرہٗ ہندی زبان کی ایک مثل اور کہاوت سنایا کرتے تھے کہ ان کے یہاں یہ کہاوت بہت مشہور ہے کہ: ’بنیے سے سیانا سو باؤلا‘۔

یعنی اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں تجارت میں بنئے سے زیادہ سیانا اور ہوشیار ہوں اور اس سے زیادہ تجارت جانتا ہوں تو وہ باؤلا اور پاگل ہے اس لیے کہ حقیقت میں تجارت کے اندر کوئی شخص بنیے سے زیادہ سیانا نہیں ہوسکتا، یہ کہاوت سنانے کے بعد حضرت والد صاحب فرماتے کہ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں صحابہ کرامؓ سے زیادہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق ہوں اور صحابہ کرامؓ سے زیادہ محبت رکھنے والا ہوں وہ حقیقت میں پاگل ہے، بے وقوف اور احمق ہے، اس لیے کہ صحابہ کرامؓ سے بڑا عاشق اور محبّ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

آپ کا مقصد بعثت کیا تھا؟

صحابہ کرام کا یہ حال تھا کہ نہ جلوس ہے، نہ جلسہ ہے، نہ چراغاں ہے نہ جھنڈی ہے، اور نہ سجاوٹ ہے، لیکن ایک چیز ہے وہ یہ کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ زندگیوں میں رچی بسی ہوئی ہے، ان کا ہر دن سیرتِ طیبہ کا دن ہے، ان کا ہر لمحہ سیرتِ طیبہ کا لمحہ ہے، ان کا ہر کام سیرتِ طیبہ کا کام ہے، کوئی کام ایسا نہیں تھا جو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ سے خالی ہو، چونکہ وہ جانتے تھے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے دنیا میں تشریف نہیں لائے تھے کہ اپنا دن منوائیں اور اپنی تعریفیں کرائیں، اپنی شان میں قصیدے پڑھوائیں، خدا نہ کرے اگر یہ مقصود ہوتا تو جس وقت کفار مکہ نے آپ کو یہ پیشکش کی تھی کہ اگر آپؐ سردار بننا چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا سردار بنانے کے لیے تیار ہیں، اگر آپ مال و دولت کے طلبگار ہیں تو مال و دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لانے کے لیے تیار ہیں، اگر آپ حسن و جمال کے طلبگار ہیں تو عرب کا منتخب حسن و جمال آپ کی خدمت میں نذر کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ آپ اپنی تعلیمات کو چھوڑ دیں اور یہ دعوت کا کام چھوڑ دیں، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ چیزیں مطلوب ہوتیں تو آپؐ ان کی اس پیشکش کو قبول کرلیتے، سرداری بھی ملتی، روپیہ پیسہ بھی مل جاتا اور دنیا کی ساری نعمتیں حاصل ہوجاتیں، لیکن سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر تم میرے ایک ہاتھ میں آفتاب اور ایک ہاتھ میں ماہتاب بھی لاکر رکھ دو گے تب بھی اپنی تعلیمات سے ہٹنے والا نہیں ہوں۔

کیا آپ دنیا میں اس لیے تشریف لائے تھے کہ لوگ میرے نام پر عید میلاد النبیؐ منائیں؟ بلکہ آپ کے آنے کا منشاء وہ ہے جو قرآن کریم نے اس آیت میں بیان فرمایا کہ:

”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الاٰخِرَ وَ ذَكَرَاللّٰهَ كَثِيْرًا“ [سورۃ الاحزاب:۲۱] یعنی ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے پاس بہترین نمونہ بنا کر بھیجا ہے، تاکہ تم ان کی نقل اُتارو اور اس شخص کے لیے بھیجا ہے جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہو۔

انسان نمونے کا محتاج ہے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نمونے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب نازل فرمادی تھی، ہم اس کو پڑھ کر اس کے احکام پر عمل کرلیتے؟ بات دراصل یہ ہے کہ نمونے بھیجنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ انسان کی فطرت اور جبلت یہ ہے کہ صرف کتاب اس کی اصلاح کے لیے اور اس کو کوئی فن، کوئی علم و ہنر سکھانے کے لیے کافی نہیں ہوتی، بلکہ انسان کو سکھانے کے لیے کسی مربی کے عملی نمونے کی ضرورت ہوتی ہے، جب تک نمونہ سامنے نہیں ہوگا اس وقت تک محض کتاب پڑھنے سے کوئی علم اور کوئی فن نہیں آئے گا، یہ چیز اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں داخل فرمائی ہے۔

(جاری)

☆☆☆☆☆

دین و ایمان

مدارس اسلامیہ دین کے قلعے

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

اللہ تعالیٰ کا قانون ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے، اور حدیث میں بھی اس کو بیان کیا گیا ہے، وہ ہے بقائے انفع کا قانون، جو چیز نافع ہے، جو اس کے علاوہ ہے بہہ جانے والی اور غائب ہوجانے والی ہے، اور اسی کو حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے کہ سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہونچائے، یا جو لوگوں کو نفع پہونچاتا ہے، تو یہ بقائے انفع کا قانون بے لاگ ہے، جو جتنا نفع پہونچانے والا ہوگا اتنا ہی باقی رہے گا اتنا ہی مضبوط رہے گا، اتنا ہی توانا رہے گا، اور اپنی نفع پہونچانے والی صفت میں وہ کافی رہے گا، تو ہم لوگوں کو یہ چیک کرتے رہنا چاہیے اور بار بار دیکھتے رہنا چاہیے کہ ہمارا نفع کم تو نہیں ہو رہا ہے، کیونکہ مدارس جو ہیں وہ نفع پہونچانے کے مراکز ہیں، ایک طرف سے لیتے ہیں، دوسری طرف دے دیتے ہیں، وہاں سے لیتے ہیں جہاں سے کوئی نہیں لے پاتا، اور ان کو دیتے ہیں جو لے نہیں پاتے، جو خاص طور سے براہ راست لے نہیں پاتے ان کو پہونچاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے مدارس کے اندر یہ صفت رکھی تھی، اب یہ صفت ہمارے اندر سے ہی ختم ہوتی چلی جارہی ہے، اس وجہ سے نگاہیں اٹھ رہی ہیں لوگوں کی ہماری طرف، جب ہم نفع والے تھے تو نگاہیں اٹھنے سے دور تھے، جب نفع کم ہوگیا یا ختم ہوتا جارہا ہے تو حالات خراب ہورہے ہیں، جب آپس میں ناچاقی ہوتی ہے تو لڑائی ہوتی رہتی ہے۔

جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

آپ نے سنا ہوگا کہ جب زیادہ پیسے والے جمع ہوجاتے ہیں تو لڑائی زیادہ ہوتی ہے، آپ نے زیادہ آرام سے رہنے والوں کو زیادہ پیسوں والوں کو بے تکے الفاظ سے لڑتے نہیں دیکھا ہوگا، کبھی بھی کہ سامنے گریبان پکڑ لیں لڑنے لگیں، لیکن یہ جو چھوٹے لوگ ہوتے ہیں ایک ایک دو دو پیسے پر لڑنے لگتے ہیں کیونکہ ان کے پاس خاکہ نہیں ہے اور جس کا نفع زیادہ ہوتا ہے، اس کی سطح زیادہ بلند ہوتی ہے، وہ لڑتے نہیں ہیں تو اب اس طرح مدارس میں باتیں ہیں، کیونکہ نفع ختم ہوتا جارہا ہے، اور اگر یہ سب نہیں ہے تو نفع باقی ہے۔

پاور ہاؤس کا Conection صحیح ہو

یہ مدارس جو ہیں ان کے بہت سے کام ہیں، نمبر ایک وہ سارے کے سارے نفع سے وابستہ ہیں، ایک تو یہ ہے کہ وہ بجلی لیتے ہیں اصل مرکز سے، یا یوں کہہ لیجیے گنگا اور جمنا سے، دجلہ اور فرات سے، وہ نہریں جو آسمانی ہیں ان کا ذکر قرآن وحدیث میں آیا ہے، اور ان سے بجلی پیدا کرتے ہیں، اور بجلی کو پاور ہاؤس کی حیثیت سے رکھتے ہیں، پھر ساری دنیا میں سپلائی کرتے ہیں، اور دو وہ نہریں ہیں قرآن وحدیث، قرآن وحدیث سے جو بجلی اکھٹا کرتے ہیں تو پاور ہاؤس کی حیثیت ہوجاتی ہے، اور جس کو جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنی ہی وہ استعمال کرتا ہے، تو یہ پاور ہاؤس ہیں لیکن یہ پاور ہاؤس بجلی اس وقت پائیں گے، جب ان کا کنکشن ہوگا گنگا اور جمنا سے، اور دجلہ اور فرات سے، جب ان سے تعلق ہوگا تب ان کو بجلی ملے گی، اور ان سے تعلق نہیں ہوگا تو چاہے ادھر ادھر کتنے ہی تعلق ہوں جتنے مذاہب ہیں عیسائی ہوں یہودی ہوں ان سب کا کیا معاملہ ہے ان کا رابطہ گنگا جمنا سے نہیں ہے، اور یہودیوں کا اور عیسائیوں کا بھی کٹ گیا ہے، اور انہوں نے نمبر تین اور نمبر چار بلکہ اس کے بعد بھی لوگوں کے اقوال سے ہی وابستگی اختیار کرلی، تو جب اصل سے رشتہ کٹ گیا، تو انرجی جو تھی سپلائی کی، وہ ختم ہوگئی، اور ان کا وہ حال ہوگیا جو عمومی طور پر ایسے لوگوں کا ہوتا ہے جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا ہے، تھوڑا بہت رہتا ہے وہ بھی بہت جلدی ختم ہوجاتا ہے اور وہ کام کا بھی نہیں رہتا، کیونکہ اس کے اندر پاور نہیں رہتا، پاور پاور ہاؤس کے پاس رہتا ہے، بڑی مشین اسی سے چلتی ہے، چھوٹی مشینیں اس سے چل جاتی ہیں تھوڑے وقت کے لیے، اس کے لیے کنکشن چاہیے تو ایک کام تو مدارس کا پاور ہاؤس کا ہے، تو اب خود دیکھنا لینا چاہیے کہ ہمارا تعلق قرآن وحدیث سے کیسا ہے؟ اگر قوی ہے تو سمجھ لیں نفع ہے، ہمارے اندر ہم پاور ہاؤس کی حیثیت رکھتے ہیں اور جب نفع نہیں ہے تو پھر ظاہر کہ قلم جہاں لگاتے ہیں قلم دل کے پاس لگا ہوتا ہے، لیکن یہ کہ قلم دل کے پاس اس وقت تک رہتا ہے جب تک چل رہا ہے، اور نفع باقی ہے، اس کا نفع اگر ختم ہوجائے قلم کا، تو نکال کے باہر پھینک دیا جاتا ہے، اس لیے کہ لکھنے کی اس کے اندر صلاحیت نہیں رہی، ایسے ہی مدارس کا معاملہ بھی ہے کہ آپ کیا دے رہے ہیں امت کو؟ قرآن اور حدیث سے لیا کیا اور امت کو دیا کیا؟ یہ ضروری ہے۔

مدارس شفاخانے ہیں

نمبر دو یہ مدارس شفاخانے بھی ہیں تاکہ مریض آکر یہاں اپنا علاج کرا سکے، یہاں ہر طرح کی دوا ملتی ہے، یہاں ہر طرح کا آپریشن ہوتا ہے یہاں بڑے بڑے کیس آتے ہیں مریض کے، اور مریض شفا پاکے چلے جاتے ہیں، تو اگر آپ کے پاس دوائیں ہیں اور نسخے ہیں تو ظاہر ہے اس کا تعلق بھی اسی سے ہے، قرآن وحدیث سے، یعنی قرآن مجید وحدیث سے ایسا تعلق ہے کہ آپ اس سے علاج کر سکیں بتا سکیں مسئلہ کا حل یہ ہے، اور اس کو بھی قرآن وحدیث میں ڈھونڈ سکیں، جس جگہ یہ مسئلہ آتا ہو کہ قرآن وحدیث سے مسئلہ پیش کرو، تو اس کے لیے ہے قرآن مجید میں "إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ" [محمد:۷] مدد خدا کی کرو، مدد وہ تمہاری کرے گا، اس کی مدد کا مطلب کیا آپ جانتے ہیں ؟ یعنی اس کے دین کی مدد کرو، اللہ تم پر احسان اس وقت کرے گا جب تم اس کی مخلوق پر احسان کروگے اور تم مخلوق پر کیسے احسان کروگے، یہ ذرا لمبی بات ہے، وقت کم ہے، آپ ماشاء اللہ پڑھے لکھے حضرات ہیں، تو آپ سمجھ لیں کہ کیسے احسان کرنا ہے مخلوق پر، اور مخلوقات میں کتنی قسمیں ہیں جو آپ کا احسان چاہتی ہیں، ان سب پر احسان کرو تو اللہ کا احسان آپ پر ہوگا، اور ان حالات سے بچائے جاؤ گے، تو گویا کہ نسخے آپ کے پاس ہوں، جو مریض آئے، لگا دیجیے اس کو کہ یہ آپ استعمال کریں، یہ آپ استعمال کریں، تو یہ شفاخانے ہوں، کچھ دن رکھ لیا جائے، یہاں پر جس کو کہا جاتا ہے ہر چہ بزرگان بدنمک شد، تو اب یہاں کوئی آجائے تو شفا پاکر ہی نکلے گا، یہ نہیں کہ مریض ہو جائے مدرسوں میں، ایسا نہ ہو مدرسہ گئے تھے، مدرسہ کا روگ ہی لگ گیا، وہ بھی آپ جانتے ہیں، اب کوئی ایسی چیز تو نہیں جو الگ سے آئے ہوں مدرسوں میں ہے کیا؟ یہ میں بھی جانتا ہوں، تو مدرسوں میں شفا جیسی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہو رہی ہے ختم ہوگئی، خود مدرسے مریض ہیں ان کو شفا کی ضرورت ہے، کہ کوئی ڈاکٹر ہو اور آکر پہلے ان کو ٹھیک کرے، شفاخانوں کو ٹھیک کرے، تاکہ یہ شفا کے نسخے نکال کر دے، تو مدرسے جو ہیں وہ شفاخانے بھی ہیں، لیکن ہیں اور تھے کا مطلب ضائع ہے۔

سابقہ کتب تھیں، قرآن ہے

اب آپ سمجھ لیجیے جیسے میں کہا کرتا ہوں بہت سارے غیر مسلمین میں کہ تورات، انجیل، زبور یہ تو قرآن میں ہیں، اور وید اور گیتا یہ بھی ہیں اور اس کے اندر ایسی چیزیں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں یہ، بلکہ اس وقت تورات، اور انجیل سے زیادہ توحید وید میں ہے، یہ عجیب بات ہے توحید جتنی وید اور گیتا میں ہے، اتنی انجیل اور تورات میں نہیں ہے، اور قرآن کے برابر بالکل تو نہیں کہہ سکتے، لیکن قریب قریب دونوں میں کھلی ہوئی توحید ملتی ہے، لیکن یہ کتابیں تھیں اور قرآن ہے، یہ فرق ہے، یہ تھیں، قرآن ہے، تو ایسے کہیں ہمارے ساتھ نہ ہو جائے، کہ تھے اور ہیں نہیں، ہونا چاہیے ایک شفا خانہ میں ہونا چاہیے۔

مدارس اسلام کے قلعے ہیں

نمبر تین یہ کہ یہ قلعے ہیں، پناہ گاہیں ہیں کوئی دشمن کسی کو بھگا رہا ہو تو مدرسوں میں آجائے گا، محفوظ ہو جائے گا، یہ نہیں کہ مدرسوں میں آکر اور نظروں میں چڑھ جائیں کہ یہ گڑبڑ ہے، یہ دہشت گرد ہے، یہ فلاں ہے، ایسا نہیں ہے پناہ گاہ پہونچ جانے کے بعد، ہے کسی کی ہمت کہ کوئی ہاتھ ڈال سکے، اور کوئی گزند پہونچا سکے، اس لیے کہ اس کا تعلق کس سے ہے، "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" [الحجر:۹] سے ہے، کہ ہم نے الذکر کو نازل کیا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں، تو گویا کہ ہمارا تعلق الذکر سے ہے تو الذکر کی حفاظت کا مطلب کیا ہوا، جو چیزیں االذکر سے وابستہ ہیں ان کی بھی حفاظت کی جائے، قرآن اعلان کر رہا ہے بڑے زور سے کر رہا ہے اور اس کا مشاہدہ کرا رہا ہے تو ایک مشاہدہ تو یہ ہے ہی ہر آدمی جانتا ہے کتنے حافظ ہیں، ہے کوئی جو قرآن کے سوا حافظ ہو جائے اور اس کو یاد کر لے؟ ابھی ایک سکھ صاحب ملنے آئے ہم سے، تو ہم نے کہا کہ آپ کے دھرم کا کوئی حافظ ہے؟ - ندوہ میں بیٹھے ہوئے تھے وہ - تو میں نے کہا ندوہ میں تو ماشاء اللہ ہزار حافظ ہوں گے ہی، اور پورے ہندوستان میں پچاس لاکھ حافظ ہیں، ہندوستان میں صرف، تو پوری دنیا میں کتنے حافظ ہوں گے، چونک گئے، تو ہم نے کہا کہ کسی کی مجال ہے کہ قرآن مجید میں گھٹا بڑھا سکے، کر ہی نہیں سکتے، حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام فرمایا یہ بھی عجیب ہی ہے کہ علماء سے بھی حفاظت ہوگی، گویا کہ آپ اور ہم وابستہ ہو گیے ان علوم سے اور قرآن و حدیث سے تو ہم محفوظ ہیں۔

قرآن والے کی بھی حفاظت اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے

جس کی آخری مثال حضرت شیخ عز الدین بن عبد السلام ان کے بارے میں شاید آپ نے کچھ پڑھا ہو، شیخ عز الدین بن عبد السلام جب مصر تشریف لے جا رہے تھے، شام سے نکلے راستہ میں ایک شہر پڑا تو پورا شہر استقبال کے لیے نکل آیا، اور انہوں نے کہا.....

بقیہ صفحہ ۲۵ پر

راہ ہدایت

کمالِ عبدیت کا سبق

مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

انبیاء علیہم السلام کی جن صفات کا تذکرہ قرآن مجید میں ملتا ہے ان میں عبدیت بھی ہے، اکثر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ عبد کی صفت کا ذکر موجود ہے، لیکن جس کمال عبدیت کا تذکرہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مذکور ہے، وہ اور کہیں نہیں ملتا، یوں تو متعدد آیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ''عبد'' کے لفظ سے کیا گیا ہے، اور اللہ نے اس کی نسبت اپنی ذات کی طرف فرمائی ہے، ذیل میں وہ آیات درج کی جاتی ہیں:

"وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ" [البقرۃ: ۲۳] (اور اگر تم اس چیز کے بارے میں ذرا بھی شبہ میں ہو جس کو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو اس جیسی ایک سورہ ہی بنا لاؤ اور اللہ کے علاوہ اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو اگر تم سچے ہو)۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَنزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجاً" [الکھف: ۱] (اصل تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں کوئی پیچیدگی نہیں رکھی)۔

"تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْراً" [الفرقان: ۱] (وہ ذات بڑی برکت والی ہے جس نے اپنے بندہ پر فیصلہ (کی کتاب) اتاری تاکہ وہ دنیا جہان کو خبردار کرنے والا ہو)۔

"وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَداً" [الجن: ۱۹] (اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ کھڑا ہو کر اس کو پکارتا ہے تو وہ اس پر ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگا لیتے ہیں)۔

لیکن ان تمام آیات میں ایک آیت وہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال عبدیت کی طرف اشارہ کرتی ہے، تمام قرآن مجید میں جہاں جہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے، ان میں مقام معراج سے بڑھ کر کون سی آیت ہوگی، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ اس شان کے ساتھ کیا ہو جس کا تتمہ سورہ نجم میں کیا گیا ہے۔

واقعہ معراج کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے اور احادیث مبارکہ میں اس کی تفصیلات ملتی ہیں، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و کمال کے ان مقامات میں سے ہے، جس میں کوئی آپ کا شریک نہیں اور اس کا پس منظر بھی اگر سامنے رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے انتہائی اعزاز اور تسلی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت کے کام میں مشغول ہیں، ہر طرف سے یلغار ہو رہی ہے، حضرت خدیجہ آپ کی غمگسار ہیں، جناب ابو طالب پشت پناہی فرما رہے ہیں کہ یک بیک دونوں اس عالم فانی سے ایک ہی سال میں رخصت ہو جاتے ہیں، اب مشرکین مکہ کے سامنے ظاہر میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو محسوس فرما رہے ہیں، دل صدمہ سے چور ہے، کوئی بات ماننے والا نہیں، سوائے چند غریب مسلمانوں کے، آپ اس خیال سے طائف تشریف لے جاتے ہیں کہ شاید وہاں بات بنے اور وہ لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں، لیکن وہاں جس طریقہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستایا گیا وہ مہمان نواز عربوں کی تاریخ کا سیاہ باب ہے، کوئی نو وارد مہمان کو بٹھاتا، ایک تھکا ماندہ انسان دور سے آیا ہے، کوئی ہمدردی کے دو بول بولتا، بجائے اس کے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسائے جا رہے ہیں، گالیاں دی جا رہی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں لہولہان ہیں، کسی طرح آپ کے خادم آپ کو لے کر ایک باغ کے کنارے پہنچتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر اس وقت یہ دعا جاری ہوتی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ٹوٹے ہوئے دل کی آواز ہے اور فصاحت و بلاغت کی دنیا میں ایک درنایاب ہے، آپ فرماتے ہیں:

"اللّٰهم اليك أشكو ضعف قوتي وقلة حيلتي وهواني على الناس يا أرحم الراحمين، أنت رب المستضعفين وأنت ربي الى من تكلني، الى بعيد يتجهّمني أو الى عدو ملكته أمري، ان لم يكن على غضب فلا أبالي ولكن عافيتك هي أوسع لي، أعوذ بنور وجهك الذي أشرقت له الظلمات وصلح عليه أمر الدنيا والآخرة من أن ينزل بي غضبك أو يحل علي سخطك لك العتبى حتى ترضى ولا حول ولا قوة الا بك"

[الدعاء للطبرانی:۱۰۳۶] (الٰہی! اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کی تحقیر کی بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، درماندہ عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے، مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے، کیا بیگانہ ترشرو کے یا اس دشمن کے جو کام پر قابو رکھتا ہے، لیکن جب مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اس کی کچھ پروا نہیں، کیونکہ تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسیع ہے، میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں، جس سے سب تاریکیاں روشن ہوجاتی ہیں اور دین و دنیا کے کام اس سے ٹھیک ہوجاتے ہیں کہ تیرا غضب مجھ پر اترے یا تیری رضامندی مجھ پر وارد ہو، مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے، اور نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے)۔

ان حالات میں آپ جب واپس مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے ہیں، تو ایک رات آسمانوں پر آپ کو بلایا جاتا ہے، جنت و دوزخ کی سیر کرائی جاتی ہے، انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوتی ہیں اور سب سے بڑھ کر باری تعالیٰ کا وہ قرب و اختصاص حاصل ہوتا ہے کہ عالم تصور میں اس کو لانا مشکل ہے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ قرآن مجید میں جس لفظ کے ساتھ ہوتا ہے، وہ 'عبدہٗ' ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْرَی بِعَبْدِهٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَی الْمَسْجِدِ الْأَقْصَی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ آیَاتِنَا إِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ" [الاسراء:۱] (پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گئی، جس کے آس پاس ہم نے برکت رکھی ہے تاکہ ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھادیں بلاشبہ وہ خوب سنتا خوب جانتا ہے)۔

انتہائی کمال کے موقع پر عبد کا تذکرہ کمال عبدیت کی ایک کھلی علامت ہے، اور یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کی وہ صفت ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں جلوہ گر نظر آتی ہے، وہ مکہ مکرمہ کی کسمپرسی کا دور ہو یا مدینہ منورہ کی فتوحات کا، جب دنیا کے خزانے آپ کے قدموں میں تھے، لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونا شروع ہوئے مگر زندگی کے ہر لمحہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عبدیت ہر رخ سے نمایاں نظر آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو عظمت و محبوبیت آپ کو عطا فرمائی وہ جن و بشر ہوں یا ملائکہ، ہر مخلوق اس کے آگے گراں بار ہے، لیکن خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے سامنے کھڑے ہیں، قدم مبارک پر ورم آجاتا ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کردیے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "أفلا أکون عبداً شکوراً" [سنن ابن ماجۃ:۱۴۸۴] (کیا میں شکرگذار بندہ نہ بنوں)۔

ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا ہے اور اس پر کپکپی طاری ہوجاتی ہے، تو فرماتے ہیں کہ تم ڈرتے کیوں ہو، میں تو ایک ایسی خاتون کا بیٹا ہوں جو سوکھے گوشت کے ٹکڑوں پر گذارا کرلیتی تھی۔ [ابن ماجہ:۳۴۳۷]

ایک معمولی باندی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کررہی ہے، اور آپ ہمہ تن اس کی بات سن رہے ہیں، اور کہیں سے ناگواری کا اظہار نہیں ہوتا، یہ انتہائی عبدیت ہی تو ہے کہ لوگوں کے پیچھے چلنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گوارہ نہیں، سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا سخت ناپسند ہے، مجلس میں بھی کوئی امتیازی جگہ قبول نہیں، کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کرتا ہے تو اس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا دست مبارک نہیں کھینچتے جب تک وہ خود ہی اپنا ہاتھ نہ ہٹالے۔

ہجرت کے موقع پر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق اکبر کے ہمراہ مدینہ منورہ تشریف لائے تو مخدوم اور خادم میں فرق کرنا مشکل تھا، حضرت صدیق اس کو تاڑ گئے، اور کھڑے ہوکر چادر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سایہ کرلیا تاکہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیں۔

غزوۂ احد کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مدینہ منورہ ہی میں رہ کر مقابلہ کرنے کی تھی، مگر نوجوان صحابہؓ نے جب نکل کر مقابلہ کرنے کی رائے دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے پر اس کو ترجیح دی، اور نہ جانے کتنے ایسے مواقع ہیں۔

گھر میں خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کام کاج میں مشغول ہیں، حدیث میں آتا ہے: "کان یفلی ثوبه ویحلب شأته ویخدم نفسه" [شمائل الترمذی:۲۹۳] (آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کپڑے خود صاف کرتے، بکری کا دودھ دوہتے، اپنا کام خود کرتے تھے)۔

گھر والوں کے ساتھ ہنسی دل لگی بھی ہے، لیکن کمال واعتدال کے ساتھ، اذان کی آواز سنی حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس وقت لگتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو پہچانتے ہی نہیں۔ [صحیح البخاری:۶۰۳۹]

حضرات حسنینؓ آپ کی گود میں ہیں، آپ ان کو چوم رہے ہیں، لپٹا رہے ہیں، اور ان سے اظہار محبت فرما رہے ہیں، حضرت اسامہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم گود میں لیتے ہیں، چومتے ہیں، اور اظہار محبت فرماتے ہیں، فتح مکہ کے موقع پر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فاتحانہ مکہ مکرمہ داخل ہوتے ہیں تو اس شان عبدیت کے ساتھ سر مبارک جھکا ہوا ہے لگتا ہے کہ اونٹ کے کوہان سے لگ جائے گا اور اس وقت سواری پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے غلام زادوں کو سوار فرما رکھا ہے۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر سواریاں کم ہیں، دو دو تین صحابی باری باری ایک سواری پر سوار ہوتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے بھی یہی ترتیب قائم فرما رکھی ہے۔

خندق کھودی جارہی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں شریک ہیں، ایک صحابی بھوک کی شدت کا تذکرہ فرماتے ہیں اور پیٹ کھول کر دکھاتے ہیں کہ اس پر پتھر بندھا ہوا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تسلی دیتے ہیں، پھر معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیٹ پر دو دو پتھر باندھ رکھے ہیں۔

غزوۂ بدر اسلام کا پہلا معرکہ ہے، حق و باطل کی فوجیں آمنے سامنے ہیں، رات کا وقت ہوا لوگوں نے آرام کیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مصروف دعا ہیں، اور اس تضرع و عبدیت کے ساتھ کہ شانہ مبارک سے چادر گر گر جاتی ہے۔

یہ کمال عبدیت نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ کی زبان مبارک سے دعا میں یہ الفاظ نکل رہے ہیں: "اللّٰھم أحینی مسکیناً وأمتنی مسکیناً واحشرنی فی زمرۃ المساکین" [المستدرک للحاکم: ۷۹۱۱] (اے اللہ! مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ، اور مسکین بنا کر وفات دے، اور مسکینوں ہی میں میرا حشر فرما)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: "ابغونی فی الضعفاء" [سنن أبی داؤد: ۲۵۹۶] (مجھے کمزوروں میں تلاش کرو)۔

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے چند پھول ہیں جو مشام جان کو معطر کرنے کے لیے بہت ہیں، ورنہ آپ کی مبارک زندگی انسانیت کا ایسا دل نواز باغ ہے جس کے جھونکے قیامت تک اللہ کے بندوں کو کمال بندگی کی خوشبو دیتے رہیں گے اور لوگ اس سے اپنے بندگی کے چمن کو سنوارتے رہیں گے، کمال بندگی کے یہ وہ پھول ہیں جو کبھی مرجھانے والے نہیں، ان کی خوشبو ہمیشہ کے لیے ہے اور سب کے لیے ہے۔

سورۂ اسراء سے ''کمال عبدیت'' کا سبق انسانیت کو دیا گیا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی اس کا جمال بھی ہے کمال بھی، اور اعتدال کا ایسا راستہ بھی جو بھی اس راستہ پر چلے گا وہ راہ ہدایت کا راہی شمار ہوگا، اور نہ جانے کتنے بے راہ رووں کی ہدایت کا ذریعہ بنے گا۔

☆☆☆☆☆

.....بقیہ صفحہ ۲۲ کا

ہمارے یہاں چلیے ہم سب آپ کو بٹھاتے ہیں، کہا کہ سب کچھ اپنی جگہ پر ہے لیکن میرا علم بہت زیادہ ہے، میرا علم تمہارے شہر کا تحمل نہیں کرسکتا، مصر گئے، وہاں کے بادشاہوں نے استقبال کیا شیخ الاسلام بنایا، شیخ الاسلام بنتے ہی انہوں نے فتوے جاری کیے اور کہا بادشاہ کی حکومت ناجائز ہے، لمبا قصہ ہے وقت نہیں ہے، آخر جو قصہ ہے ان کا وہ یہ ہے کہ سارا مصر خلاف ہوگیا سارے بادشاہ، وزراء اور سب نے کہا اس مولوی کو نکالو، یہی بہت گڑبڑ ہے، وہ روز بیٹھے بیٹھے یہی سب کرتا رہے گا تو سب نے طے کرلیا کہ ان کی چھٹی کرنی ہے، سب آگئے ان کے گھر پر، تلواریں وغیرہ لے کر کے اور سارے جمع ہوگئے، اور دروازہ کھٹکھٹایا، شیخ کے بیٹے باہر نکلے اور جب نکل کر دیکھا تو اس کو اندازہ ہوگیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے، تو بیٹے نے جا کر اندر کہا ابا! باہر معاملہ گڑبڑ ہے تو انہوں نے اپنے بیٹے سے بڑے اطمینان سے کہا تمہارے ابا کے حق میں شہادت کہاں لکھی ہے؟ - یہ ہے محفوظ ہونا - تمہارے ابا کے حق میں شہادت کہاں لکھی ہے؟ بس یہ کہہ کر باہر نکلے اور یوں کہا: بھائی کیسے آئے؟ سب کی تلواریں نیچے گر گئیں، اور کہنے لگے حضور کہیے کیا چاہتے ہیں؟ کہنے لگے میں تم سب کو بیچوں گا لے جا کر نخاس میں اور پھر نخاس میں بیچا، بیچنے کے بعد بادشاہ بنایا میں سمجھتا ہوں پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا، یہ تجربہ نہیں ہے لیکن یہ جو میں نے کہا ہے، اب آپ خود فیصلہ کرلیں کہ یہ ہیں، یا تھے، یا کیا ہیں؟ آج بھی اگر وہ مقام پیدا ہوجائے تو کوئی کچھ نہیں کرسکتا لیکن اب چونکہ پہلا ہی مسئلہ نہیں رہ گیا کہ قرآن وحدیث سے ہمارا تعلق ہوجائے، اور اس سے ہم لیں، لیکن ہم تو اپنے ہی کو کھوئے ہوئے بیٹھے ہیں ہم کیا کام انجام دیں، مختصر سا وقت ہے اور یہ مختصر سی بات ہے لیکن اپنے کو سمجھو پہلے کہ ہم کیا تھے، اور کیا ہوگئے، ہم کو کیا کرنا تھا، اور کیا کر رہے ہیں، اور کیا کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی مدد فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

صحبتے با اہل دل

معاشرے پر تعلیم وتربیت کے اثرات

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کے مجلسی افادات

ترتیب وپیشکش: محمد سلمان بجنوری ندوی

تعلیم وتربیت کا معاشرے سے بڑا گہرا تعلق ہے، اچھے معاشرے اور اچھی سوسائٹی کی پہچان اس کے تعلیم یافتہ افراد سے ہوتی ہے، ایسے ہی برے معاشرے کی پہچان یہ ہے کہ اس میں تعلیم وتربیت کا کوئی نظام نہ ہو، معاشرہ بنتا ہی ہے ایسے افراد سے جو تعلیم یافتہ ہوں، ان کی اچھی تربیت ہوئی ہو، جس کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہوں، ہمسایوں کا حق پہنچانتے ہوں، اعلیٰ قدریں ان کے اندر پائی جاتی ہوں، اچھے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہوں، دکھ درد میں ایک دوسرے کے شریک رہتے ہوں، وہ تمام صفات جو ایک مجتمع میں ہونی چاہیے وہ تمام صفات ان افراد میں موجود ہوں، تو یہ مجتمع مجتمع ہے، یہ معاشرہ معاشرہ کہنے کے لائق ہے۔

لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہے، یعنی لوگ غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ ہیں، معاشرے کے آداب سے ناآشنا اور اچھے اخلاق اور اچھی قدروں سے عاری ہیں، تو ایسے معاشرہ کو معاشرہ نہیں اس کو اسطبل یا مویشیوں کا باڑا کہیں گے، جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جن کو دوسروں کے حقوق سے کوئی سروکار نہیں، کسی کے دکھ تکلیف اور رنج وغم سے کوئی تعلق نہیں، جہاں کوئی کسی کے تعاون کو تیار نہ ہو، مزید یہ کہ سب ایک دوسرے کے مخالف ہوں، ہر ایک دوسرے سے نفرت کرتا ہو، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے، نقصان پہنچانے کے درپہ ہو اور ایک دوسرے کی تکلیف پر خوش ہوتا ہو، بدکلامی، بدمزاجی، بداخلاقی اور ترش روئی سے ایک دوسرے کے ساتھ پیش آتا ہو، ایک دوسرے کی شکل دیکھنا پسند نہ کرتا ہو، صبر وضبط اور برداشت کا مادہ ہی نہ ہو، ہر وقت دوسرے کے مال پر نظر ہو، کسی کی کامیابی ایک آنکھ نہ بھاتی ہو، حسد، جلن، کینہ، بغض و عداوت جیسی صفات رذیلہ طبیعت ثانیہ بن چکی ہوں، اگر دو لوگوں کی آپس میں ملاقات ہوجائے تو ہر ایک کو یہ اندیشہ ہو کہ سامنے والا کوئی نقصان نہ پہنچادے، اس کے علاوہ سب اپنے کھانے کمانے میں مگن ہوں، اپنی ہی فکر میں لگے ہوں، آپ خود فیصلہ کریں کہ کیا آپ اس قسم کے معاشرہ کو معاشرہ سے تعبیر کریں گے؟، کیا ایسے خودغرض، مطلب پرست اور کینہ پرور افراد کے درمیان آپ کو جینے کا کوئی مزہ آئے گا؟

تعلیم وتربیت معاشرے کا ہی حصہ ہیں، تعلیم تربیت سے جڑی ہے اور یہ دونوں معاشرہ سے جڑے ہیں، تینوں کے مجموعہ کو معاشرہ کہا جاتا ہے، موجودہ دور میں ایسے معاشرہ کا فقدان ہے جو نبوی معاشرہ کا نمونہ ہو، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا سماج تیار کیا تھا جس کی مثال قیامت تک نہیں دی جاسکتی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس معاشرہ کے افراد کی تعلیم کا بھی انتظام کیا تھا اور تربیت کا بھی، وہاں ہر ایک دوسرے کا خیال رکھتا تھا، چھوٹے بڑوں کا ادب کرتے اور بڑے چھوٹوں پر شفقت فرماتے تھے، پڑوسی کے حقوق، ہمسایہ کے حقوق، والدین کے حقوق، بچوں کے حقوق، استاد کے حقوق، مہمان کے حقوق، رشتہ دار کے حقوق، بیوی شوہر کے حقوق، مذکورہ تمام حقوق کی ادائیگی وہ بڑے سلیقہ سے کرتے تھے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ان تربیت یافتہ پاک ہستیوں کی سب سے اہم صفت ایثار - یعنی اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دینا - تھی، جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کی ہے: ”وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ“ اس کی سینکڑوں مثالیں ہم صحابہ کرامؓ کی سیرت میں دیکھیں گے، صرف ایک مثال سے ہم ان کے ایثار وقربانی اور جذبہ محبت اور خیر خواہی کا اندازہ لگا سکتے ہیں، وہ یہ کہ جنگ یرموک کے موقع پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے دنیائے انسانی کو حیران کردیا، اگر کتب سیر وتاریخ میں یہ واقعہ محفوظ نہ ہوتا تو لوگوں کا اس پر یقین کرنا مشکل ہوتا، یہ جنگ بڑی فیصلہ کن جنگ تھی اس کے قائد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ

عنہ تھے، عیسائیوں کو اس جنگ میں شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا، البتہ مسلمانوں کا بھی بھاری نقصان ہوا، کئی بڑے صحابہؓ نے جام شہادت نوش فرمایا، اس جنگ میں ایک صحابی اپنے چچازاد بھائی کی تلاش میں نکلے، تلاش کرتے کرتے جب ان تک پہنچے تو ان کو سخت پیاس کی حالت میں پایا اور جیسے ہی پانی کا برتن ان کے ہونٹوں سے لگایا کہ قریب سے ایک صاحب کے کراہنے کی آواز آئی، تو انہوں نے اپنے ساتھی کو پلانے کا اشارہ کیا، اتنے میں ایک تیسرے ساتھی کے کراہنے کی آواز آئی، انہوں نے تیسرے کو پانی پلانے کا اشارہ کیا، یہ صاحب تیسرے کے پاس پہنچے تو وہ دم توڑ چکے تھے، دوسرے کے پاس دوڑ کر آئے تو وہ بھی دم توڑ چکے تھے، اخیر میں اپنے چچازاد بھائی کے پاس آئے تو وہ بھی زخموں کی تاب نہ لاکر شہید ہو چکے تھے، زخموں سے چور ہیں، پیاسے تڑپ رہے ہیں لیکن اپنے بھائی سے پہلے پانی پینا گوارا نہیں کیا، ایسی نادر مثال آج تک دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔

یہ ہے نبوی معاشرہ اور کہاں آج کا ہمارا معاشرہ، یہ حضرات ضرورت ہوتے ہوئے اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے اور ہمارا یہ حال ہے کہ زائد چیز بھی اپنے کسی ضرورت مند بھائی کو نہیں دے سکتے، اللہ تعالیٰ ہمارے اس معاشرے کو اسلامی اور نبوی معاشرہ بنا دے، تمام اخلاقی قدریں ہمارے اندر پیدا فرمادے، آمین۔

☆☆☆☆☆

غضب اور سخت ناپسندیدگی کا باعث

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

ایک اہم چیز جو عالم غیب میں بھی بڑا اثر رکھتی ہے، اور ملی واجتماعی زندگی میں بھی اس کے اثرات بہت وسیع اور دوررس ہیں، وہ مسلمانوں کا اپنے ذاتی معاملات پر اور اپنی دلچسپی کے دائرہ میں اسراف و فضول خرچی، شہرت وعزت کے حصول یا رسم ورواج کی پابندی میں بے دریغ روپیہ صرف کرنا، اور اپنے پڑوسیوں، عزیزوں، اور ملت کے دوسرے افراد کے فقر وفاقہ، اضطرار واضطراب اور ان افسوس ناک حالات سے چشم پوشی اور بے حسی ہے، جن میں کم ازکم انقلاب کے بعد مسلمان اس ملک میں مبتلا ہوگئے ہیں، اس میں ذرہ شبہ نہیں کہ یہ صورتحال اللہ تعالیٰ کی حکیم وعدیل ذات اور ربوبیت اور رحمت عامہ صفات کے لیے غضب اور سخت ناپسندیدگی کا باعث ہے کہ ایک ایسے ماحول اور زمانہ میں جہاں ایک کثیر تعداد نان شبینہ کی محتاج ہو، جاں بلب مریض دوا اور برہنہ تن شریف مرد وعورتیں ستر پوشی سے محروم ہوں، کہیں کسی بیوہ کے چولہے پر توا اور کہیں کسی غریب کے جھونپڑے میں دیا نہ ہو، ایک ایک دعوت اور ایک ایک تقریب میں ہزاروں لاکھوں روپیہ بے دریغ خرچ کیے جائیں؟۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد حسان ندوی جوارِ رحمت میں

مولانا محمد کلام الدین ندوی (معاون انچارج مجلس تحقیقات ونشریات، ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے چھوٹے برادر نسبتی مولانا ڈاکٹر محمد حسان ندوی اپنے آبائی وطن پتھنہ بھاگلپور میں یکم ستمبر ۲۰۲۲ء مطابق ۴ صفر المظفر ۱۴۴۴ھ کو ۳ بجے دن بروز جمعرات سڑک حادثہ میں شدید زخمی ہوگئے، ہسپتال لے جائے گئے لیکن وقت موعود آن پہنچا اور جمعہ کی رات تقریباً ساڑھے سات بجے مالک حقیقی سے جاملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم علمی ودینی گھرانے میں ۵ مارچ ۱۹۷۶ء کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم بڑے ابا مولانا خلیل احمد قاسمیؒ اور والد محترم علامہ محمد عثمان قاسمیؒ سے حاصل کی، آگے کی تعلیم کے لیے سرائے میر اعظم گڑھ گئے، وہاں سے خانقاہ رحمانی مونگیر آئے، پھر واپس وطن چلے گئے، اس کے بعد مدرسہ ضیاء العلوم میدانپور رائے بریلی میں ثانویہ رابعہ میں داخلہ ہوا، یہاں ان کی طبیعت لگ گئی اور اپنی تعلیم میں مشغول ہوگئے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا جب قیام رائے بریلی میں ہوتا تو وہ حضرت مولاناؒ کی علمی اور نورانی مجلس سے فائدہ اٹھاتے۔

۱۹۸۸ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء آئے، چار سال کی تعلیم کے بعد ۱۹۹۱ء میں فراغت ہوئی، پھر بھاگلپور میں ہی ایک مسلم کالج سے بی.اے.، فائنل کیا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی.یو.ایم.ایس تعلیم مکمل کی، اس کے بعد علی گڑھ اور لکھنؤ کے ہسپتالوں میں کچھ سال رہے، ۲۰۰۷ء میں سلطان گنج بھاگلپور ہسپتال میں میڈیکل افسر کی حیثیت سے بحالی ہوئی اور خدمت خلق کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ مرحوم عیدین کے خطیب بھی تھے، علاقہ کی دینی، دعوتی وعلمی پروگراموں سے بہت دلچسپی تھی، چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خطابت کا اچھا ملکہ دیا تھا، تقریریں بھی کرتے اور جلسوں کی نظامت بھی، پسماندگان میں اہلیہ، تین بھائی اور چار بہنیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کرے، ان کے درجات بلند کرے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے، اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

علم وادب

مولانا سید ابوالخیر حسنیؒ برقؔ کا علمی وادبی ذوق

ایک طائرانہ تجزیہ

سید عرفان عامر حسینی ندوی

کافی دنوں سے اس عظیم شخصیت پر کچھ لکھنے کا دل چاہ رہا تھا، لیکن اس خیال سے قلم آمادہ نہ ہوا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے تو ''پرانے چراغ'' میں ان کا تفصیلی ذکر خیر کر دیا ہے، تو ہم جیسے کس قطار شمار میں؟ لیکن پھر بھی دل نہیں مانا اور برق صاحب سے تعلق نے قلم کو آمادہ کرلیا۔

مولانا ابوالخیر برقؔ حسنی رحمۃ اللہ علیہ میری نانی کے سگے بھائی تھے، وہ محدث اور ادیب تھے، انہیں عربی فارسی اور اردو زبان پر عبور تھا، ماہر لسانیات اور قادر الکلام شاعر تھے، ۱۹۰۲ء میں تکیہ کلاں رائے بریلی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی، پھر باضابطہ تعلیم کے لیے ندوہ بھیج دیے گئے، لکھنؤ کا اس وقت کا ماحول بہت راس آیا، لکھنؤ اور لکھنویت مزاج میں سرایت کر گئی تھی، لکھنوی زبان کے ترجمان اور تہذیب وشائستگی میں اپنا ایک طرز رکھتے تھے، زبان ولب ولہجہ پر عبور تھا، وہ لکھنوی کہلانے کے مستحق تھے، مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''پرانے چراغ'' میں برق صاحب مرحوم کے متعلق لکھتے ہیں:

''لکھنؤ قیام ہی کے زمانہ میں ان کو لکھنؤ کی زبان سیکھنے، لکھنؤ کی زبان بولنے کا شوق کیا عشق پیدا ہوگیا تھا، زبان کی غلطی اور محاورے کے خلاف بولنے کو گناہ کبیرہ سمجھتے تھے''۔

[پرانے چراغ: ج۲/ص۲۸۶]

اس وقت کے معروف اور ہردل عزیز شاعر ابوالفضل شمسؔ لکھنوی کے خاص شاگرد تھے اور آخر تک انہی کے رہے، آگے مولانا علی میاںؒ لکھتے ہیں:

''اسی طالب علمی اور نوجوانی کے دور میں وہ مولانا عبدالحلیم شررؔ کے یہاں آنے جانے لگے اور مستفید ہوتے، لیکن شرر صاحب کے ہی کہنے پر انہوں نے شمس لکھنوی کے آگے شرف تلمذ حاصل کیا، اسی لیے شمس صاحب کا رنگ برق صاحب کی زبان میں صاف چمکتا ہے''۔

[پرانے چراغ: ج۲/ص۲۸۶]

مزید دینی تعلیم کے لیے حجاز تشریف لے گئے اور حرم مکی میں زیر تعلیم رہے اور وہیں سے حدیث کی سند حاصل کی، آپ کا حدیث سے شغف ومحبت کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

''بھائی مرحوم کو کب اور کس طرح اس کا خیال آیا یہ تو معلوم نہیں، لیکن انہوں نے مؤطا اور صحیح مسلم یاد کرنے کا بیڑا اٹھایا، دونوں کتابوں کی ہزاروں حدیثیں مع سند کے انہوں نے حفظ کرلیں، ہم لوگوں میں یہ چرچا تھا کہ مؤطا پوری ان کو یاد ہے اور مسلم کا بھی ایک خاصہ حصہ، وہ ادنیٰ مناسبت سے حدیث مع سند کے پڑھنا شروع کر دیتے تھے، اس وقت ان کے چہرے پر خاص چمک، آواز میں سوز واثر محسوس ہوتا تھا، وہ بڑے دل کش عربی لہجہ میں احادیث کی تلاوت کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور ان کی روح اس سے وجد میں آرہی ہے''۔

[پرانے چراغ: ج۲/ص۲۹۷]

درج ذیل نظم مولانا سید ابوالخیر حسنیؒ برقؔ کی ہے، جو آپ نے نہایت کم سنی میں کہی تھی، سن بلوغت کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ شعری ذوق پیدا ہوگیا تھا، بچپن ہی سے حسن ذوق حافظہ وذہانت خداداد تھی، ان کی مثال خاندان میں بمشکل تھی، ہم نے اپنے بڑوں سے خاص کر نانی رحمہا اللہ سے سنا ہے کہ یہ نظم انہوں نے تقریباً ۱۳ یا ۱۴ سال کی عمر میں کہی تھی، جو ان کے حسن ذوق وادراک لسانی کی دلیل ہے، یہ نظم نانی مرحومہ نے مجھے دی تھی۔

احساسات وجذبات، مزاج کی لطافت، حسن سخن، ذوق ظرافت، ادبی شعور جو خاندانی پس منظر کا آئینہ دار ہے، تکیہ کا جغرافیائی جائے وقوع اس میں مزید موسم برسات کا سہانا پن، ان تمام اسباب وعوامل اور مؤثرات کے آپس میں ہم آہنگ ہونے سے انسانی شعور ووجدان کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ برق صاحب مرحوم کی کم عمری کی شاعری میں نظر آنے لگی اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موسم کے ساتھ خود بھی جھوم اٹھتے ہیں، نظم ملاحظہ ہو:

کالی گھٹا ہے، ٹھنڈی ہوا ہے
پھول کھلے ہیں، فضل خدا ہے
یعنی خزاں کا زور گھٹا ہے
پانی ہی پانی ہر سو بھرا ہے

غنچہ گل اب جا کے کھلا ہے
منہ کو دھلانے ابر چلا ہے
باغوں میں کیسی پھولوں کی صف ہے
پینے والا جام بکف ہے
موتیا نرگس بیلا چمیلی
سوسن ومصری کا سن وجوھی
نغمہ قمری شور عنادل
کیسی سجی ہے باغ میں محفل
بادل گرجا، بجلی چمکی
رعد نے اپنی تیغ علم کی
زور گھٹا کا کم تو ہوا ہے
آج کا منظر ہوش ربا ہے
نیند سے بیلیں جھوم رہی ہیں
سر کو اٹھا کے چوم رہی ہیں
پتے پتے پر ہیں یہ قطرے
چھپ گئے تارے شرم سے گھٹ کے

مولانا ابوالخیر برق حسنی مرحوم کی یہ نظم ان کے اعلیٰ ادبی ذوق واحساس اور زیرکی کا نمایاں مظہر ہے، اتنی کم عمری میں ایسا دل آویز انداز اور شعور ووجدان کی کیفیت شاذونادر ہی کسی میں ملے۔

میں نے مولانا ابوالخیر حسنی برق مرحوم کو جو کچھ بھی بچپن میں دیکھا اور ان کے متعلق پڑھا سنا اور جانا، اتنا ضرور کہوں گا کہ ان کے کلام میں ایک بہترین منجھے ہوئے شاعر کی ساری خصوصیات کی جلوہ گری نظر آتی ہے جو اس فن میں ان کو معتدل راہ تلاش کرنے میں کامیاب کرتی ہے، جسے ندرت آفرینی سے موسوم کیا جاسکتا ہے، کہتے ہیں:

کچھ نہ کچھ ساقی رہے دل کے بہلنے کا سبب
آنکھ کی گردش رکے تو بزم میں ساغر چلے

مولانا ابو الخیر برق مرحوم کی مناجات پر مشتمل ایک کتابچہ ''دعائے مضطر'' شاہ کار بھی ہے جو انتہائی رقت آمیز ہونے کے ساتھ ساتھ بندے کا رب سے مناجات وسرگوشی کا من حیث المعنی مفہوم سمجھ میں آتا ہے، وہ اپنے کلام ''دعائے مضطر'' میں جہاں ثقیل، عسیر الفہم اور جاہ وحشمت والے الفاظ سے کلام کو بوجھل اور چیستاں بنانے سے گریزاں ہیں تو وہیں سادہ عام سے الفاظ کو دینی وادبی روح کے ساتھ اس ہنر مندی سے استعمال کرتے ہیں کہ اس کی معنویت میں بلندی، وسعت، گہرائی وگیرائی در آتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں کسی پیچیدگی و ابہام کا شائبہ تک نظر نہیں آتا، بلکہ فصاحت وبلاغت بے ساختگی برجستگی عیاں ہے، جس سے لفظوں کے نہاں خانے میں موجود کلام کی روح تک پہنچنے میں قاری کو کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آتی، ان کے اسلوب کلام کے مطالعہ کے بعد احساس ہوا کہ ان کی شخصیت کو نکھارنے اور سنوارنے میں خاندانی پس منظر و اعلیٰ انسانی قدروں کا لحاظ، دینی مزاج اور مکارم اخلاق کی کرشمہ سازی ضرور پوشیدہ ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ ان کا ادبی وعلمی سرمایہ محفوظ نہ رہ سکا۔ رحمه الله رحمة واسعة وجعل مثواه الفردوس الأعلى برحمتك يا أرحم الراحمين.

☆☆☆☆☆

اوراقِ زندگی

(جلد اول)

ماضی کے جھروکوں سے کچھ تاریخی وخاندانی جھلکیاں۔ زندگی کے کچھ سبق آموز واقعات۔ مطالعاتی وتدریسی مشاغل، تعلیمی ودعوتی اسفار۔ اہم دینی، علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات سے ملاقاتیں۔ دینی، ملی، تعلیمی اور دعوتی تحریکات سے وابستگی کا حال۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

صفحات: ۵۰۴--- قیمت: ۴۰۰/روپئے

ڈاک مصارف کے ساتھ صرف ۲۵۰/روپئے

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

ٹیگور مارگ، ندوہ کیمپس، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فون نمبر: 0522-2741539 موبائل نمبر: 9889378176

ای میل: info@airp.org.in

رسید کتب

تعارف وتبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

نام کتاب: عجائب القرآن

تالیف: سید جاوید احمد ندوی

گذشتہ نصف صدی میں سائنس نے بڑی تیزی سے بڑے بڑے میدان سر کیے ہیں، اور جدید سائنسی تحقیقات وانکشافات نے ایک طرف دنیا کا نقشہ بدل دیا ہے تو دوسری طرف انسانی زندگی میں شعور وآگہی کی اک نئی فضا قائم کردی ہے، ہزاروں خام افکار جو صدیوں سے 'علمِ یقین' کا درجہ حاصل کیے ہوئے تھے' نئے انکشافات نے ان پر ایمان کو نہ صرف متزلزل کیا ہے؛ بلکہ ان کا استحصال کردیا ہے۔

"وَ لِلّٰہِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ"، آسمان وزمین کے سارے سپاہی اللہ ہی کے ہیں؛ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو بھی جو اس پر ایمان نہیں رکھتے' اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرلیتا ہے، اور وہ محسوس یا غیر محسوس طریقہ پر اللہ کی کتاب کی صداقت اور اس کے دین کی حقانیت ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں، اور جو ان میں سلیم الطبع ہیں' اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت سے بھی نوازتے جاتے ہیں۔

غور کریں تو سائنس 'علم النفس' سے لے کر 'علم الاکوان' تک کے سفر میں جا بہ جا کتاب اللہ کی خدمت میں لگی ہوئی ہے، اور قرآن نے "وَ فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" سے لے کر "اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" تک جن کائناتی حقائق میں بصیرت اور نظر پیدا کرنے کی دعوت دی ہے' گویا یہ فریضہ آج وہ لوگ ادا کررہے ہیں جو اللہ کی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

تسلیم کہ انسان احکام شریعت کے جاننے اور ان پر عمل کرنے کا مکلّف بنایا گیا ہے، آخرت میں کامیابی و ناکامی بھی اسی پر منحصر ہے، اور امت محمدیہ کو اسی کی دعوت دینے کی ذمہ داری دی گئی ہے؛ لیکن اس دعوت میں حکمت اختیار کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے، اور ان سے بہتر طریقہ سے مناظرہ اور مباحثہ کا حکم بھی دیا گیا ہے؛ "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ"، اور حکمت کا تقاضہ ہے کہ جن حقائق کو غیر مسلم تسلیم کرتے ہیں' انہی کو ان کے سامنے پیش کیا جائے، اور جس طرح کے دلائل وہ پیش کرتے ہیں یا طرزِ جدال وہ اختیار کرتے ہیں' اسی طرح کے دلائل کے ساتھ اور اسی طرح کے اسلوب میں ان کو جواب دیا جائے۔

قرآن کے نزول کے وقت سائنس کا دور دورہ نہیں تھا؛ البتہ قصہ گوئی اور اسلاف وامم کا ذکر اس دور کی خطابت وشاعری کا خاص موضوع تھا، یہاں تک کہ خطیب کو خطیب کے بجائے 'قاص' (قصہ گو) وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا، اسی لیے قرآن نے ان اقوام واسلاف کا ذکر اپنی دعوت میں کیا جن کے ذکر سے عرب، خواہ کفار ہوں یا اہلِ کتاب' خوب آشنا تھے، اور جا بہ جا 'الزامی جواب' کی مثالیں بھی قرآن میں کثرت سے پائی جاتی ہیں' جن میں حق تعالیٰ کی طرف سے اہل کفر وضلال کی باتوں کو انہی کے انداز میں ان پر پلٹ دیا گیا، اور اس طرح وہ بالکل لاجواب ہوکر رہ گئے۔

آج کے دور میں سب سے زیادہ لوگ سائنسی تحقیقات وانکشافات پر رکھتے ہیں، خاص طور پر غیر مسلم سائنس کے سامنے اپنے مذہب کا مذاق اڑاتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور فرسودہ مذہبی تجربات وسماجی خرافات سے منھ موڑتے جارہے ہیں، کوئی بھی موضوع ہو-طبی ہو، مذہبی ہو، یا سماجی یا کوئی اور، ہر موضوع میں بحث مناظرہ کے لیے سائنسی معلومات سے لیس ہونا ضروری ہے، حال یہ ہے کہ اگر آج صبح کے اخبار میں آجائے کہ فلاں پھل یا فلاں غذا کے کھانے سے فلاں مرض پیدا ہورہا ہے' تو لوگ نہ صرف خود اس سے پرہیز کرنے لگتے ہیں؛ بلکہ دوسروں تک بھی فوراً اس خبر کو پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایسے ماحول میں داعیانِ اسلام اور ان لوگوں کے لیے جن کو غیروں سے مذہبی مباحثوں اور مناظروں کا موقع ملتا ہے' ازحد ضروری ہے کہ کتاب وسنت اور احکامِ شریعت میں جو سائنسی حقائق پوشیدہ تھے اور اب سائنس داں حضرات ان کا انکشاف کررہے ہیں' ان کا علم حاصل کیا جائے، اور بہ طور خاص دعوت میں اور اسلام کے تعارف میں ان کا استعمال کیا جائے۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے

سائنسی ترقیات کا آغاز ہوا' اس وقت سے ہمارے مفسرین میں بھی رفتہ رفتہ اپنی تفسیروں میں نئی تحقیقات و انکشافات کو پیش کرنے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ عرب مفسرین میں شیخ شعراوی اور شیخ وہبہ زحیلی نے اپنے تفسیری خطابات و تالیفات میں ان معلومات کا خوب استعمال کیا ہے، اور ایک عالم کو متاثر کیا ہے۔

موجودہ دور میں سوشل میڈیا کے عام ہونے کے بعد 'اسلام اور سائنس' کے موضوع سے لگاؤ رکھنے والوں میں شیخ محمد راتب نابلسی اور ڈاکٹر عبد الدائم کحیلی کی شخصیات بہت نمایاں ہیں۔ خاص طور پر ڈاکٹر کحیلی نے ، باوجودیکہ ان کی سب باتوں سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا اور اس قاعدہ سے کوئی بشر مستثنیٰ بھی نہیں، تاہم وہ اس بات میں ممتاز ہیں کہ ان کا مطالعہ دونوں طرف کا کافی گہرا ہے، اور وہ قرآن میں سائنس یا سائنس میں قرآن کو تلاش کرنے میں قیامت کی نگاہ رکھتے ہیں۔ علی منصور کیالی نے بھی اس میدان میں اپنے جوہر دکھلانے کی کوشش کی؛ لیکن ان کے نظریات وانحرافات کی وجہ سے 'اہلِ علم ونظر نے ان کو یکسر مسترد کردیا، جس کی بنیادی وجہ یہی رہی کہ وہ عقل ونقل میں اعتدال قائم نہیں رکھ پائے؛ بلکہ خالص عقل کے ہوکر رہ گئے۔ ہندوستان کے ڈاکٹر ذاکر نائک کا نام بھی اس فہرست میں لیا جاسکتا ہے، جنہوں نے اسلام کے تعارف میں سائنس واسلام کے موازنہ سے کافی فائدہ اٹھایا۔

جہاں تک اردو مفسرین کی بات ہے' اس زمرہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا عبد الماجد دریابادی رحمہما اللہ سرِ فہرست ہیں، جن کی تفسیروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کے نزدیک سائنسی مطالعہ کی کیا اہمیت تھی۔ ہمارے ندوۃ العلماء کے ایک قابلِ فخر فرزند مولانا عبد الباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو سائنس وفلسفہ کے مطالعہ کے لیے نہ صرف اپنی زندگی وقف کردی تھی؛ بلکہ اس کام لیے انھیں وظیفہ بھی جاری کیا گیا تھا، اور انھوں نے تقریباً پچاس سال کا عرصہ اس موضوع پر صرف کیا اور ان کی معرکۃ الآراء تصنیف ''مذہب اور سائنس'' معرضِ وجود میں آئی، اور برصغیر ہندوپاک کے علماء اسلام کو فکر وتحقیق کا ایک نیا میدان عطا کرگئی۔ ان کے بعد یہ سلسلہ قائم رہا اور مختلف مضامین اور کتابیں مذہب و سائنس کے حوالہ سے آتے رہے؛ لیکن ان کی حیثیت ایک سرسری مطالعہ سے زیادہ نہیں رہی۔

آج ہمارے سامنے اس سلسلہ کی اہم کڑی، ہمارے ہی ہم درس مولانا سید جاوید احمد ندوی صاحب کی تالیف ''عجائب القرآن'' ہے۔ اور اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا کہ موصوف نے روایتی انداز اختیار نہ کرتے ہوئے موضوع اور تحقیق دونوں کا حق ادا کردیا ہے۔ ابھی تک اردو کے تفسیری مواد میں اس طرح کی تفصیل، تدقیق اور تحقیق سائنس کے حوالہ سے ہمیں نظر نہیں آئی۔

اس کتاب میں مختلف ابواب کے تحت مختلف سائنسی انکشافات اور قرآنی آیات سے بحث کی گئی ہے، جو زیادہ تر یا بالعموم Cosmology اور Creation Science (علم فلکیات وتخلیق کائنات) سے تعلق رکھتی ہے، یہ موضوعات حسبِ ذیل ہیں:

باب اول: قانونِ کشش اور قرآن، باب دوم: زمین کا محلِ وقوع اور قرآن، باب سوم: زمین کی کرویت اور قرآن، باب چہارم: زمین کی حرکت اور قرآن، باب پنجم: پہاڑ اور قرآن، باب ششم: سورج، چاند اور قرآن، باب ہفتم: سات زمینوں کا وجود اور قرآن، باب ہشتم: کائنات کی تخلیق اور قرآن، باب نہم: جدید سواریوں کی ایجاد اور قرآن۔

مصنف نے جس عرق ریزی اور محنت سے یہ مباحث تیار کیے ہیں' اس کا اندازہ کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہوجاتا ہے، انہوں نے پوری کوشش کی ہے کہ تحقیق کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے؛ خواہ وہ لغوی ہو، یا نحوی وصرفی ہو، ادبی و بلاغی ہو، قدیم مفسرین کا بیان ہو، متاخرین کی رائے ہو یا عصر جدید کے اہلِ علم کا نکتۂ نظر، مصنف نے سب کا جائزہ لے کر اپنی رائے قائم کرنے میں اعتدال ومیانہ روی کا بھرم بھی باقی رکھا ہے، جس کے لیے ہم موصوف کو مبارکباد پیش کرتے۔

درمیانی سائز میں ساڑھے پانچ سو صفحات کی اس کتاب کے مصنف موصوف جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ میں حدیث و ادب عربی کے استاد ہیں، اس سے قبل ''زمین کی حرکت اور قرآن'' کے عنوان سے ایک رسالہ تالیف کرچکے ہیں، جو اب اس کتاب کا حصہ ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کتاب اہلِ علم و تحقیق سے داد وتحسین حاصل کرے گی، اور اسلام واہلِ اسلام کے حق میں نافع بنے گی، و مـــا ذلك على الله بعزيز.

☆☆☆☆☆

ہمارا سماج

وہ ہم میں سے نہیں!

محمد جمیل اختر جلیلی ندوی

کون ہم میں سے نہیں؟ اور کیوں؟ کیا ایسے عہدوں پر براجمان رہنے والے؟ جو ہر ہر کام کے بدلے میں رشوت طلب کرتے ہیں، جو پیسوں کی خاطر ایسے امور پر دستخط کردیتے ہیں، جہاں انھیں دستخط نہیں کرنے چاہئیں، جو پیسے نہ ملنے کی صورت میں صحیح دستاویز پر دستخط نہیں کرتے، جن کے نزدیک پیسوں کے معاملوں میں غریب بھی غریب نہیں ہوتا، جو سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کے پیسوں میں بھی اپنا حصہ نکال لیتے ہیں، جو بے گھر غریبوں کو دیے جانے والی اسکیم میں بھی پانچ دس فیصد حصہ اپنے لیے نکال ہی لیتے ہیں، جو چاول کے پیسے کھاجاتے ہیں، جو طلبہ کو ملنے والے اسکالرشپ تک کو ہضم کرجاتے ہیں اور نہ جانے کہاں کہاں وہ حصے نکالتے رہتے ہیں۔

یا وہ ہم میں سے نہیں، جو عوام کے ووٹ سے جیتتے ہیں اور جیتنے کے بعد عوام کو بھول جاتے ہیں، جو اپنی کرسی کے لیے امن وسلامتی کا ماحول خراب کرتے رہتے ہیں، جو عوام کے خدمت گزار بننے کی بجائے غنڈہ گردی پر اتر آتے ہیں، اگر وہ کسی کمپنی میں کسی بے روزگار کو روزگار سے جوڑ دیں تو اس بے چارہ کی تنخواہ کی ایک تہائی اپنی جیب میں ڈال لیتے ہیں، جو جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہیں، جو جملے بازیاں زیادہ اور عوامی کام کم کرتے ہیں، جو اپنی پنچایت اور اپنے علاقہ میں ترقیاتی کوئی بھی کام نہیں کرتے، نہ اسکول وکالج بنواتے ہیں، نہ سڑکیں درست کرواتے ہیں، نہ علاج ومعالجہ کے لیے کوئی ہسپتال ہی تعمیر کرواتے ہیں۔

کیا ڈاکٹر ہم میں سے نہیں؟ کیوں کہ وہ بلاوجہ آپریشن کردیتے ہیں، مریض کو ڈراتے ہیں، تشخیص کے نام پر بلاضرورت دل کھول کر جانچ کرواتے ہیں اور اس کے لیے اسی لیب میں بھیجتے ہیں، جہاں سے ان کے لیے کمیشن کی ایک بڑی رقم طے ہوتی ہے، بلاضرورت صرف پیسے لینے کے لیے وٹامنس کی دوائیں ڈھیر ساری دے دیتے ہیں، بلاضرورت پانی کی کئی کئی بوتلیں چڑھادیتے ہیں۔

یا انجینئر (خاص طور پر سول انجینئر) ہم سے نہیں؛ کیوں کہ وہ پیسوں کی خاطر ایسے نقشے پاس کردیتے ہیں، جو قانونی لحاظ سے پاس نہیں ہونے چاہئیں، وہ پیسے بچانے کے چکر میں میٹریل اس سے کم مقدار میں ڈالتے ہیں، جتنی مقدار میں ڈالنا چاہیے، نتیجۃً حادثات رونما ہوجاتے ہیں، یا بجلی کے شعبے میں کام کرنے والے انجینئر ہم میں سے نہیں، جو بجلی کے اتنے کھمبوں کی منظوری دے دیتے ہیں، جتنوں کی ضرورت نہیں ہوتی، یا ایسی ایسی جگہوں پر ٹرانسفارمر لگوادیتے ہیں، جہاں ضرورت نہیں ہوتی؛ لیکن اس کے شناسا ہوتے ہیں اور ایسی جگہوں سے صرف نظر کرتے ہیں، جہاں واقعی ضرورت ہوتی ہے، یا دیگر شعبوں میں کام کرنے والے انجینئرس، جو اپنے محکموں میں ایسے کام کرتے ہیں، جو نہیں کرنے چاہئیں۔

کیا استاذ وٹیچر ہم میں سے نہیں، جو طلبہ کی صحیح تعلیم وتربیت کی بجائے صرف وقت گزاری کرتے ہیں، جو وقت پر نہ آتے ہیں، نہ ڈھنگ سے کتاب پڑھاتے ہیں؛ لیکن سرکار سے موٹی موٹی یا طے شدہ تنخواہیں لیتے ہیں، یا وہ ارباب اہتمام ہم میں سے نہیں، جو قوم سے بچوں کے نام پر اچھی خاصی رقمیں وصولتے ہیں؛ لیکن کھانا بھی صحیح طور پر نہیں کھلاتے، جو طلبہ کی رہائش کے لیے ڈھنگ سے انتظام بھی نہیں کرتے، جو اساتذہ کو حق الخدمت بھی پورے طور پر نہیں دیتے، جب کہ اپنے لیے تمام طرح کی آسائشیں مہیا کرلیتے ہیں، یا وہ تجار ہم میں سے نہیں، جو کم ناپتے ہیں، ڈنڈی مارتے ہیں، جو خراب سامان کو جھوٹ بول کر فروخت کرتے ہیں، یا وہ ملازمین اور مزدور ہم میں سے نہیں، جو کام چور ہوتے ہیں، جو دو دن کے کام کو آٹھ دن میں کرتے ہیں؛ تاکہ آٹھ دن کی حاضری مل سکے، آخر کون ہم میں سے نہیں؟ یا یہ سب ہم میں سے نہیں، جی ہاں! ایسے تمام افراد ہم میں سے نہیں، جو اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرتے، جو ذمہ داری سے بھاگتے ہیں، جو اپنے اوپر کے لوگوں کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور اپنے نیچے کے لوگوں کو بھی دھوکہ دیتے ہیں۔

انھیں لوگوں کے کے تعلق سے تو پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: من غشّنا فلیس منا [صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۰] (جو ہمیں دھوکہ دے، وہ ہم میں سے نہیں)، مذکورہ افراد اسب کے سب اپنے اپنے عمل میں دھوکہ دہی کا کسی نہ کسی صورت میں ارتکاب کر رہے ہیں، ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لاج رکھیں اور اپنی اپنی ذمہ داریوں کو پوری تندہی کے ساتھ ادا کریں، ہر ایک کے ساتھ نصح و خیر خواہی کا معاملہ کریں، کسی کے ساتھ دھوکہ اور چھل کا معاملہ نہ کریں، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق دے، آمین۔

☆☆☆☆☆

فقہ وفتاویٰ

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی

سوال: طلاق شرع اسلامی میں کیا گناہ کی چیز اور قابل نفرت عمل ہے؟ اگر ایسا ہے تو ایسی بیوی جس کا کردار مشکوک ہو اور اس کے قرائن بھی موجود ہوں تو کیا اس کو طلاق دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ ایسی صورت میں بھی طلاق دینا گناہ اور مبغوض عمل ہے؟

جواب: شرع اسلامی میں طلاق بنیادی طور پر ناپسندیدہ عمل ہے، مجبوری میں اس کی اجازت دی گئی ہے، اگر بیوی کا کردار مشکوک ہو اور اس پر قرائن بھی موجود ہوں تو ایسی صورت میں شوہر کے لیے ایسی عورت کو طلاق دینے کی گنجائش ہے، تاہم بہتر یہی ہے کہ زوجیت میں رکھ کر اس کی اصلاح کی جائے، وعظ ونصیحت اور مختلف انداز سے اس کو نیک بیوی بنانے کی کوشش کی جائے لیکن اگر یہ کوششیں رائیگاں ہوجائیں تو طلاق دینا مباح ہے، حدیث نبویؐ میں اس کی صراحت موجود ہے: "لاتطلق النساء إلا من ریبة". [مجمع الزوائد: ج۴/ص۲۳۵]

سوال: محرمات سے بچنے اور فرائض وواجبات کی پابندی کرنے میں بیوی اگر شوہر کی اطاعت نہ کرے اور شوہر کی باتوں کو پوری طرح نظر انداز کرے تو ایسی صورت میں کیا طلاق دی جاسکتی ہے؟

جواب: فرائض وواجبات کی ادائیگی میں بیوی لاپرواہ ہو اور محرمات سے نہ بچتی ہو اور اس بارے میں شوہر کی ہدایات پر بھی عمل نہ کرتی ہو بلکہ مسلسل نظر انداز کرتی ہو تو شوہر کو حق حاصل ہے کہ ایسی بیوی کو طلاق دیدے، فقہاء نے لکھا ہے کہ عورت اگر فسق وگناہ کی عادی ہو تو شوہر پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا) واجب ہے، اس کے باجود اگر عورت دین پر عمل پیرا نہ ہو تو شوہر کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے۔ [الفقہ الاسلامی وادلتہ: ج۹/ص۶۸۸۰]

سوال: اگر بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر ملازمت کرے اور شوہر کے بار بار منع کرنے کے باوجود محض معیار زندگی کو بلند کرنے کے لیے ملازمت کرے تو کیا ایسی عورت کو طلاق دی جاسکتی ہے؟

جواب: نان ونفقہ کی پوری ذمہ داری اگر شوہر ادا کررہا ہو اس کے باوجود محض معیار زندگی کو بلند کرنے کے لیے بیوی ملازمت کررہی ہو اور اس کے لیے شوہر کی اجازت نہ ہو اور شوہر کے منع کرنے کی بھی پرواہ نہ کرتی ہو تو ایسی عورت کو طلاق دینا مباح ہے، کیوں کہ ملازمت کے لیے عورت کو گھر سے باہر جانے کی ضرورت پڑے گی جس کے لیے شوہر راضی نہیں ہے اور اس سے شوہر کے حقوق پامال ہوں گے جو شرع میں گناہ ہے، اس کے پیش نظر طلاق کی اجازت ہوگی۔ [حوالہ سابق]

سوال: اگر عورت کی شکل وصورت بہتر نہ ہو یا اسے بہتر پکوان کا سلیقہ نہ ہو جس کی وجہ سے وہ شوہر کی نگاہ میں پسندیدہ نہ ہو اور شوہر طلاق دینا چاہتا ہو تو کیا شرع اسلامی میں ایسی عورت کو طلاق دینے کی اجازت ہے؟

جواب: بیوی کی شکل وصورت بہتر نہ ہو یا اسے بہتر پکوان کا سلیقہ نہ ہو تو اس بنا پر طلاق دینا ممنوع اور مبغوض ہے، کیونکہ اس صورت میں طلاق دینے سے عورت کو ضرر لاحق ہوگا، جسے ازراہِ شرع روکا جائے گا، بیوی کی طرف سے ناروا سلوک ہو یا اس کی شکل وصورت پسندیدہ نہ ہو تب بھی شوہر کو صبر وتحمل سے کام لینا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے ایسے موقع پر حسن معاشرت کے ساتھ زندگی گزارنے کا حکم دیا ہے، فرمان خداوندی ہے: "وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ، فَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى أَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا" [سورہ نساء:۱۹] (اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے زندگی گزارو، پس اگر وہ تمہیں ناپسند ہو تو ممکن ہے کہ تجسس چیز کو ناپسند کرتے ہو اللہ نے اس میں بہت بھلائی رکھی ہو)۔

علامہ قرطبیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ: بدصورتی یا بداخلاقی کی وجہ سے بیوی ناپسند ہو جبکہ بیوی برائی یا نافرمانی میں مبتلا نہ ہو تو صبر وتحمل سے کام لو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں خیر پیدا کردے مثلاً نیک اولاد پیدا کردے۔ [احکام القرآن: ۵/۸۳]

محض بدصورتی کو طلاق کے لیے وجہ جواز نہیں بنانا چاہیے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانب توجہ دلاتے ہوئے فرمایا ہے: "عورتوں سے ان کے حسن کی بنا پر نکاح نہ کرو ممکن ہے کہ ان کا حسن ان کو تباہی میں نہ ڈال دے اور نہ ان کے مال کی وجہ سے نکاح کرو، ہوسکتا ہے کہ مال ان کو سرکشی پر آمادہ نہ کردے بلکہ نکاح کرو ان کی دینداری کی وجہ سے، ناک کان چھدی کالی کلوٹی باندی جو دیندار ہو کہیں بہتر ہوگی"۔ [ابن ماجہ: ج۱/ص۵۹۷]

یہ اور اس قسم کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محض حسن وجمال اور مال ومتاع کی وجہ سے نکاح نہیں کرنا چاہیے بلکہ دینداری کو وجہ انتخاب بنانا چاہیے اور محض بدصورتی اور بدسلیقگی کو طلاق دینے کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے، ورنہ سوائے نقصان اور گناہ کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

☆☆☆☆☆

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U.P. (INDIA)

باسمہٖ تعالیٰ

تاریخ ۲۵ ستمبر ۲۰۲۲ء

Date 25th September 2022

اپیل برائے تعمیر اسٹاف کوارٹرس

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ ناظم ندوۃ العلماء کی سرپرستی میں اپنی علمی ودینی خدمت میں مصروف ہے، دارالعلوم اور اس کی شاخوں میں علمی وتعلیمی امور حسب معمول جاری ہیں، اساتذہ وکارکنان ندوۃ العلماء اپنی ذمہ داریوں کو انجام دے رہے ہیں۔ اساتذہ واسٹاف کی کثرت کی وجہ سے دارالعلوم میں ان کی رہائش کی مزید گنجائش نہیں رہی تو احاطۂ دارالعلوم کے علاوہ معہد دارالعلوم ندوۃ العلماء (سکروری) میں اسٹاف کوارٹرس اور معہد سے قریب مستقل طور پر ندوہ کالونی کی سہ منزلہ عمارت تعمیر ہوئی، مگر اب بھی اسٹاف کے لیے کوارٹرس کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر ندوہ کیمپس سے متصل محلّہ مکارم نگر میں مزید اسٹاف کوارٹرس تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے بھروسہ پر یہ تعمیر شروع کرادی گئی ہے۔

جدید اسٹاف کوارٹرس کی زیر تعمیر یہ عمارت تین منزلہ ہوگی، جس میں ۹ رفیملی کوارٹرس ہوں گے، اس کی تعمیر پر مبلغ-/1,15,00,000 (ایک کروڑ، پندرہ لاکھ روپئے) کے خرچ کا تخمینہ ہے جو ان شاء اللہ اہل خیر حضرات کے تعاون سے پورا ہوگا۔

ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اس اہم ضرورت کی طرف فوری توجہ فرمائیں گے اور ندوۃ العلماء کے کارکنوں کا ہاتھ بٹائیں گے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسہ ہے کہ اس کی مدد سے یہ اہم کام تکمیل کو پہنچے گا، وما ذلك على الله بعزيز.

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) سید بلال عبدالحیٔ حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتہ پر ارسال کریں

NIZAMAT NADWATUL ULAMA
Nizamat Office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marg, Lukcnow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91 - 8736833376

پر مطلع فرمانے زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

NADWATUL ULAMA

STATE BANK OF INDIA MAIN BRANCH, LUCKNOW
(IFSC CODE : SBIN0000125)

تعمیرات

A/c. No. 1086 3759 733

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا